نگار

سالانہ چندہ ہندوستان و پاکستان
آٹھ روپیہ چھ آنہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

تصانیف نیاز فتح پوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ للہ/ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ، جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا، ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے، اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے صرہ (علاوہ محصول)

من و یزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشائیاں اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے ہمہ (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) تعداد ازواج (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۲۲ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت ہر

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور اُن افسانوں کے مطالعہ سے آپ واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے، قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی، اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ للہ/

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹہ فلاسفہ قدیم کی محفل کے ساتھ (۲) مادیین کا مذہب، نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

بعض کمیاب کتابیں

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۵۶)

تاریخ معجم اتابک اعظم ---------- ۱۲ عدد
بیاض سلسلہ انصاب صوفیان و شاہان دہلی قلمی ---- ۱۵ عدد
خصائل السعادت تاریخ و نسب نامہ افاغنہ محمد سعادت -- ۸ عدد
آئین اکبری مصور سہ حصص ابو الفضل فیضی ------- ۱۰ عدد
تاریخ جہانکشائے نادری مصور - مرزا مہدی خاں منشی مطبوعہ ایران - ۱۰ عدد
درۂ نادرہ ---- مرزا محمد مہدی خاں ------ ۸ عدد
تاریخ جہانکشائے نادری -- مطبوعہ ایران ---- ۱۲ عدد
کارنامہ حیدری -- حالات حیدر علی خاں بانی دولت میسور و حالات ٹیپو سلطان مرتبۂ شاہزادہ محمد سلطان مطبوعہ ٹائپ ۱۰ عدد

تذکرہ و سیر فارسی مطبوعہ :

تذکرہ صبح گلشن --- علی حسن خاں ------ ۱ لعد
تذکرۂ نجوم السماء --- مرزا محمد علی ------ ۳۵ عدد
سوانح عمری مولوی روم ---------- ۱۰ عدد
تذکرۃ الاکرام (تذکرۃ العلماء) مولوی عبد الحیات --- ۱۲ عدد
تذکرہ علمائے ہند -- رحمان علی ---------- ۵ عدد

ادب فارسی قلمی و مطبوعہ :

کلیات ظہیر --- حکیم ظہیر فاریابی ---------- ۵ عدد
قصاید عرفی محشی --- جمال الدین ---------- ۱ لعد
یوسف زلیخا ---- عبد الرحمن جامی ------- ۲ عدد
مثنوی نلدمن ---- ابو الفیض فیضی ---------- ۲ عدد
مثنوی غنیمت --- محمد اکرام ---------- ۲ عدد
مثنوی مخزن اسرار --- شیخ نظامی گنجوی ------- ۲ عدد
دیوان ظہیر -- حکیم ظہیر فاریابی ---------- ۱ لعد
کلیات اسمٰعیل - اسمٰعیل اصفہانی ---------- ۱۲ عدد
دیوان ناصر علی سرہندی ---------- ۲ عدد
دیوان صائب --- محمد علی صائب ---------- ۳ عدد
دیوان حافظ --- خواجہ شمس الدین محمد شیرازی مطبوعہ بمبئی ---- ۱۵ عدد
کلیات سعدی --- شیخ مصلح الدین سعدی ------ ۱۲ عدد
لیلیٰ مجنوں - نظامی - مولانا نظامی ---------- ۲ عدد

متفرق فارسی قلمی و مطبوعہ :

رقعات و مضحکات نعمت خان عالی ---------- ۵ عدد
فرسنامہ و ساہو ترنامہ - سید عبد اللہ ونکل پنڈت فارسی و ہندی قلمی ۱۲۴۳ھ - ۱ لعد
انیس العاشقین - علم کوک کے مجرب نسخے - فارسی قلمی مکتوبہ جلوس شاہ عالم بادشاہ ۱۲ عدد
شفاء المومنین - مجرب نسخے حکمائے متقدمین کے قلمی مکتوبہ
قدیم ہر دو کتب ہمجلد ---------- ۵ عدد
مجموعہ نسخہ جات اکسیر --- محمد بن ثابت نیشاپوری -- ۱۰ عدد
منتخب اللغات شاہجہانی -- عبد الرشید مطبوعہ بمبئی --- ۱۰ عدد
کشف اللغات جلد اول عبد الرحیم ---------- ۱۲ عدد
مصطلحات الشعراء محشی خلاصہ بہار عجم ---------- ۳ عدد
غیاث اللغات - محمد غیاث الدین مطبوعہ ۱۲۶۵ھ ---- ۱۵ عدد
برہان قاطع کشوری ۲ حصے کامل محمد حسین برہان ---- ۶۰ عدد
مصطلحات وارستہ - وارستہ ---------- ۲ لعد
حق الیقین - محمد باقر مجلسی قلمی خوشخط ---------- ۱ لعد
کتاب المکاتیب و الرسائل - عبد الحق دہلوی ---------- ۱۲ عدد

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

پاکستان کے خریدارانِ "نگار"

سالانہ چندہ (۱۰ روپے) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک ہمارے پاس لکھنؤ بھیجدیں۔ ہماری مطبوعات بھی اسی پتہ پر خط و کتابت کرنے سے مل سکتی ہیں:

ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی - ۱۵۰، سوجہ راج چیتوں روڈ - ویسٹ گارڈن - کراچی

اڈیٹر نگار کا قیام ۱۱ر مارچ سے ۱۹ر مارچ تک بھوپال میں رہے گا، اس لئے ذاتی خطوط کا جواب ۲۰ر مارچ کے بعد دیا جائے گا

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۹ | فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۵۶ء | شمار ۳

ملاحظات ---------- ۲
رشید احمد صدیقی ---- نظیر صدیقی ---- ۵
ہندستانی تہذیب کا ارتقاء ---- سجاد ظہیر ---- ۲۳
اقبال اور غالب ---- اثر جلیلی ---- ۲۸
خیام کی رباعیاں ---- عابد رضا بیدار ---- ۳۲
یادِ پاستین ---------- ۴۴
بھوپال کی فضائے شاعری کا ایک نجم درخشاں ---- ۴۸
منظومات .. فضا ابن فیضی - ساقی - مانی جائسی - حیات لکھنوی
سیف حسن پوری - عبداللہ خاور - شفقت - عزیز - راز - متین نیازی
بیتاب بریلوی - کنول نسیم کنجاہی - اکرم دھولیوی ---- ۵۰

ملاحظات

روس و امریکہ کی شاطرانہ چالیں

ایک زمانہ تھا جب شخصی حکومتیں اپنی سلطنتوں کی توسیع کے لئے بغیر کسی عذر کے دوسری حکومتوں پر حملہ کر دیا کرتی تھیں اور لڑائی شروع ہو جاتی تھی، اس کے بعد جب ملوکیت کو زوال شروع ہوا اور جمہوریت کا دور آیا تو اس استبداد نے دوسرا روپ اختیار کیا، یعنی جنگ کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کیا کئے جانے لگا اور یہ دور بھی دوسری جنگ عظیم کے بعد ختم ہو گیا، لیکن جنگ کا خطرہ بدستور دنیا میں باقی ہے کیونکہ ملک گیری کی رسم ختم ہونے کے بعد اب اس کی جگہ حصولِ اقتدار نے لی ہے جو اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے اور اس وقت دنیا اسی خطرہ سے کھیل رہی ہے — ایک طرف اشتراکیت ہے، دوسری طرف ڈاکریسی اور انھیں دونوں کے ذہنی تصادم کو ایک نہ ایک دن نہایت سخت تباہ کن جنگ میں تبدیل ہو جانا ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ اشتراکیت نے پچھلی ربع صدی میں کافی وسعت اختیار کر لی ہے اور یہ بھی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ڈاکریٹک حکومتوں نے جن کا قایدِ اعظم امریکہ ہے، اشتراکیت کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی زبردست طیاریاں کر لی ہیں، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ اس طرح نہ اشتراکیت کے اثرات کو وسیع ہونے سے روکا جا سکتا ہے اور نہ ڈاکریٹک حکومتوں کے رجحان کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے جنگ سے ہٹ کر کسی اور طریقہ پر غور کر سکیں۔

اس وقت ہر طرف سے "صلح و آشتی" اور "امن و سکون" کی آواز بلند ہو رہی ہے اور اس کو عملی صورت میں لانے کے لئے مختلف قسم کے زن الاقوامی اجتماعات بھی ہوتے رہتے ہیں، لیکن فضا بدستور غبار آلود ہے اور بدگمانیاں بجائے دور ہونے کے بڑھتی جا رہی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسٹالن کے زمانہ تک ان اوہام و شکوک کے بڑھانے میں روس کا زبردست ہاتھ تھا اور وہاں کے "آہنی پردہ"

نے اہلِ یورپ و امریکہ کے دلوں میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" پیدا کر دئے تھے، لیکن اب بھی جبکہ حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں اور روس خود امریکہ و برطانیہ کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے، امریکہ، روس کی اس پیشکش کو ماننے کے لئے طیار نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی اسٹالن ہی کا دوسرا چہرہ ہے لیکن ذرا مسکراتا ہوا اور مسکراتا ہوا دشمن ظاہر ہے کہ سخت خطرناک ہوتا ہے، اس سے قبل اشتراکیت کا پروپیگنڈا زیادہ تر نظریہ کی حد تک محدود تھا اور اشتراکی جماعتیں مختلف ممالک میں اس کا پروپاگنڈا کرتی رہتی تھیں، لیکن اب اس کے لئے روس نفسیات اور عملی اقتصاد کی راہیں اختیار کر رہا ہے اور دوسرے ملکوں کو خواہ وہ کسی اصول حکومت کے پابند ہوں، ہر قسم کی اقتصادی، صنعتی و تجارتی امداد دینے کے لئے آمادہ ہے اور ہمدردی و اعانت کرنے والے کی طرف مایل ہو جانا بالکل فطرتِ انسانی ہے۔

یہ طریقہ کار نیا نہیں ہے اور دوسری جنگ کے بعد سب سے پہلے امریکہ نے اس کو اختیار کیا تھا جس سے روس نے بھی بالواسطہ فایدہ اُٹھایا۔ یہ زمانہ اسٹالن کے اقتدار کا تھا اور روس خود اپنی اقتصادی اُلجھنوں میں گرفتار تھا، اس لئے وہ امریکہ کی اس ترکیب کو سمجھتا تو تھا لیکن عمل نہ کر سکتا تھا۔ امریکہ کی یہ چال اس میں شک نہیں کافی کامیاب ہوئی اور اسی کا نتیجہ اٹلانٹک پیکٹ تھا۔

اٹلانٹک پیکٹ ایک بڑا محاذ تھا روس کے خلاف اور اس کا جواب روس کی طرف سے صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ جزائر الکاہل کو امریکہ کے لئے خطرناک بنا دے اور اسی غرض سے اس نے چین و شمالی کوریا کو فوجی و اقتصادی امداد دی۔ گویا روس کا مقصد یہ تھا کہ اگر امریکہ براعظم یوروپ کو اس کے لئے ناقابل گزر بنانا چاہتا ہے تو وہ امریکہ کے خلاف ایشیا میں اپنے اثرات کو وسیع کرے، چنانچہ افغانستان اور ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات اس نے بڑھانے شروع کئے اور ہر قسم کی اقتصادی و صنعتی امداد کے لئے آمادہ ہو گیا۔

روس کی یہ چال نہ صرف اٹلانٹک پیکٹ بلکہ بغداد پیکٹ کا بھی جواب ہے جس کو پاکستان اور ایران کی شرکت نے فی الجملہ کافی اہم بنا دیا ہے۔ ہر چند بغداد پیکٹ خالص برطانیہ کی ڈپلومیسی سے تعلق رکھتا ہے اور امریکہ اس سے فی الحال علٰحدہ ہے، لیکن چونکہ مشرقِ وسطیٰ کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا اثر روس پر نہ پڑے اسلئے جلد یا بدیر امریکہ کا اس سے دلچسپی لینا ناگزیر ہے۔

بغداد پیکٹ، جب تک سعودی عرب اور مصر دونوں اس میں شامل نہ ہوں ایک کند ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے اور ان دونوں کی شرکت بہت دشوار ہے، جب تک اسرائیلی حکومت کے نکالے ہوئے دس لاکھ عربوں کی قسمت کا فیصلہ نہ ہو جائے اور امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتا جو سعودی عرب کے رجحان کے خلاف ہو۔

مشرقِ وسطیٰ میں روس کا دخول ایران کی وجہ سے آسان نہیں، لیکن اس دوران میں ایک طرف مصر و زیکوسلیویکیا کے خوشگوار تعلقات اور دوسری طرف افغانستان میں اس کے اثرات بڑھ جانے کی وجہ سے، روس کو کم از کم اس بات کا یقین ضرور ہو گیا ہے کہ اگر وہ مشرقِ وسطیٰ میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو برطانیہ و امریکہ کی کامیابی بھی یقینی نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ اگر کسی وقت اسرائیلی حکومت کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ میں جنگ چھڑ جائے تو عرب حکومتیں روس کی طرف مایل ہو جائیں، کیونکہ برطانیہ، اسرائیلی حکومت کے خلاف قدم اُٹھانے پر کسی طرح راضی نہ ہوگا۔

الغرض اس وقت بھی جبکہ ہر چھوٹی بڑی حکومت، امن و سکون ہی کی جستجو میں ہے، دنیا امن و سکون سے دور ہے اور ہمیشہ رہے گی جب تک حصولِ اقتدار کے لئے دوسروں کو ضعیف و کمزور بنانے اور حصولِ امن کے لئے امن شکن آلاتِ حرب بنانے کی پالیسی ترک نہ کی جائے۔

پاکستان کی اندرونی اُلجھنیں

خیال کیا جاتا تھا کہ دستور بننے کے بعد پاکستان میں فی الجملہ ٹھہراؤ پیدا ہو جائے گا اور اس کے بعد لوگ اطمینان سے اپنے اپنے کاموں میں لگ جائیں گے، لیکن افسوس ہے کہ یہ آرزو بھی پوری نہیں ہوئی اور وہاں کے اختلافات بجائے کم ہونے کے اور زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔

سندھ کے ایک سیاست داں نے اس پر بڑا دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر دستور جوں کا توں منظور ہو گیا تو وہ پاکستان

کو تقسیم کردے گا (۱) مذہبًا مسلم و غیر مسلم جماعتوں میں - (۲) جغرافی حیثیت سے مشرقی و مغربی پاکستان میں - (۳) لسانی اعتبار سے اُردو، بنگالی اور انگریزی میں - (۴) دستوری حیثیت سے ایسی حکومتوں میں جو نہ وفاقی ہوں گی نہ وحدانی، نہ اسلامی نہ غیر مذہبی، نہ جمہوری ہوں گی نہ آمرانہ - (۵) سیاسی حیثیت سے دو ایسی خود مختار حکومتوں میں جو مرکزی حکومت میں اپنی اپنی نیابت کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹتی رہیں گی اور (۶) اقتصادی حیثیت سے کراچی و غیر کراچی یا مرکزی و غیر مرکزی عناصر میں -

دستور میں ایک بڑا اہم مسئلہ مخلوط و غیر مخلوط انتخاب کا تھا، مغربی پاکستان کا اصرار غیر مخلوط انتخاب پر تھا اور مشرقی پاکستان مخلوط انتخاب چاہتا تھا - اس اختلاف و تصادم کو یوں دور کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہر صوبہ کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ اپنے یہاں جو صورت مناسب سمجھے اختیار کرے، لیکن اس سلسلہ میں اس نکتہ کو فراموش کر دیا گیا کہ اس طرح مشرقی و مغربی پاکستان کو مخالفت زیادہ بڑھ جائے گی اور مشرقی پاکستان کی مخالفت ایک حد تک اکثریت کی مخالفت ہے - دستور میں صدر کے مسلمان ہونے پر اسی لئے زور دیا گیا تھا کہ اگر اصولاً کسی غیر مسلم کا صدر ہونا تسلیم کر لیا گیا تو بالکل ممکن ہے کہ کسی وقت مشرقی پاکستان (جہاں ہندوؤں کا کافی اثر ہے اور جہاں کے مسلمان بھی اپنے آپ کو محض بنگالی سمجھتے ہیں اور مسلم و غیر مسلم تفریق کو اہمیت نہیں دیتے) کسی ہندو کو صدر بنانے میں کامیاب ہو جائے اور مغربی پاکستان اپنے اثر و نفوذ کو بالکل کھو بیٹھے — اس لئے اگر مشرقی پاکستان کے غیر مخلوط طریقۂ انتخاب میں ہندوؤں کا غلبہ ہو گیا تو کیا پھر وہی خدشہ سامنے نہ آ جائے گا جس سے ڈر کر حکومت کی صدارت محض مسلمان کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے -

بہر حال اس وقت بھی پاکستان میں وہی انتشار و اختلاف پایا جاتا ہے جو پہلے تھا بلکہ سچ پوچھئے تو وضع دستور کے بعد اس میں کمی ہونے کے بجائے کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے - اس میں شک نہیں کہ مرکز کو زیادہ مضبوط بنانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب مرکز کی اس مضبوطی سے فایدہ اُٹھانے کا مقصد ملک و قوم کی خدمت ہو -

اس سلسلہ میں زمیندار نے اپنے اداریہ میں بڑے پتہ کی بات لکھی ہے، آپ بھی سن لیجئے :-

ایک بھائی نے بڑی دلسوزی سے پوچھا ہے :- "برطانیہ اور امریکہ کی بات چھوڑئے کہ ان سے مقابلہ کا سوال ہی خارج از بحث ہے - آخر کیا وجہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں کارکردگی اور معیار کے اعتبار سے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتیں"

اس سوال کا جواب ایک جملہ میں یہ ہے کہ پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے ابھی تک مفادات کو اُصولوں پر قربان کرنا نہیں سیکھا جس روز انھوں نے اصولوں کی خاطر ہر قسم کے سیاسی و ذاتی مفادات کو قربان کرنا سیکھ لیا - اسی روز ان کی اور اس ملک کی تاریخ میں خود بخود ایک نئے دور کا آغاز ہو جائے گا -

پاکستان میں سیاسی جماعتوں کا ایک سرسری مطالعہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ ملک میں جب کبھی ہنگامی حالات پیدا ہوئے ہیں یا جمہوری اقدار کو کوئی صدمہ پہونچا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سیاسی جماعتوں نے اپنے اصولوں کو مفادات پر قربان کر دیا - آج ملک میں شاید ایک بھی سیاسی جماعت ایسی نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کا دامن مفاد پرستی سے بے داغ ہے - ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس ملک میں کوئی صحت مند اور قابل تقلید سیاسی روایت قایم ہو - یا ایسی سیاسی فضا پیدا ہو جس میں عوام آزادی جوش اور امنگ کے ساتھ پرورش پا سکیں -

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ صرف وہی سیاسی جماعتیں عظیم کہلا سکتی ہیں جو نتائج کے بجائے اصولوں کو عزیز سمجھیں - عمومی مفادات کو محدود ذاتی مفادات پر ترجیح دیں اور اپنے عقاید و نظریات سے کسی بھی لالچ یا خوف کے تحت دست کش نہ ہوں صرف ایسی جماعتیں قوموں اور ملکوں کی شجاعانہ رہنمائی کر سکتی ہیں - عوام میں نیا خون اور نئی زندگی پیدا کر سکتی ہیں اور اپنے منفرد - صاف اور جرأت مندانہ مسلک سے صاف پہچانی جا سکتی ہیں -

رشید احمد صدیقی

نظیر صدیقی

مضمون نگار کی رائے سے رشید صاحب کا متفق ہونا بلکہ اُن کا اس مضمون کو پڑھنا بھی ضروری نہیں۔
نظیر صدیقی

اُردو نثر میں اگر کسی نے غزل گوئی کی ہے تو وہ رشید صاحب ہیں۔ جب یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ میں نے رشید صاحب کے بارے میں بڑے پتے کی بات دریافت کرلی ہے۔ لیکن میری یہ خوشی بہت گریزپا ثابت ہوئی کیونکہ کچھ ہی دنوں کے بعد رشید صاحب کا ایک مضمون پڑھتے وقت مجھے معلوم ہوا کہ اپنے متعلق رشید صاحب نے یہ بات خود بھی دریافت کرلی تھی اور مجھ سے بہت پہلے دریافت کرلی تھی۔ وہ اپنے مضمون "اپنی یاد میں" لکھ چکے تھے کہ :-

"میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے تھے۔ مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں"

میری دریافت کا تواردمیں تبدیل ہوجانا مجھے کچھ اچھا معلوم نہ ہوا۔ لیکن مجھے اِس توارد میں تسکین و مسرت کا پہلو ڈھونڈھتے دیر نہ لگی۔ فوراً ایک مثل یاد آئی کہ بڑے آدمی یکساں طور پر سوچتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا: رشید صاحب کی عظمت پہلے سے مسلم ہے۔ میری عظمت اب مسلم ہوجائے گی یا ہوجانی چاہئے۔ یوں بھی رشید اور نظیر ہم وزن الفاظ ہیں اور لفظ 'صدیقی' دونوں ناموں میں مشترک ہے۔

لیکن جب میں نے غور کیا کہ میں نے رشید صاحب کے مضامین کو غزل سے تشبیہ کیوں دی اور خود رشید صاحب نے دونوں کو مشابہ کیوں قرار دیا تو میں نے محسوس کیا کہ رشید صاحب کے پاس ایسا کہنے کی وجہ صرف ایک ہے اور میرے پاس ایک سے زیادہ۔ انھوں نے اپنے مضامین کو غزل سے مشابہ اس لئے قرار دیا کہ وہ نظم کے مانند مربوط و مسلسل نہیں ہوتے۔ اور میں نے اس لئے بھی کہا کہ ان کے جملے مرصع غزلوں کے اشعار کی طرح حافظے کی کمزوری کے باوجود حافظے پر نقش ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ذہن میں پیوست اور دل میں جاگزیں ہوکر رہ جانے کی جو صفت اور جتنی صلاحیت اچھی غزلوں میں پائی جاتی ہے وہ بہت اچھی نظموں کے بھی حصہ میں نہیں آتی۔

ان جملوں سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُردو ادب کی پوری تاریخ میں رشید صاحب سے بہتر انشا پرداز کوئی نہیں۔ اگرچہ اُردو ادب میں انشا پردازوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ مگر وہ اتنی کم بھی نہیں کہ آپ اسے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں پر گن لیں۔ ہمارے ادب میں ایک سے ایک منفرد اور دل نشیں اسلوب رکھنے والے گزر بھی چکے ہیں اور موجود بھی ہیں۔ ان میں سے بعض نے شاعری کے سہارے نثر نگاری کی ہے اور بعض نے نثر نگاری کے بہانے شاعری۔ بعض نے اپنی نثر میں تکلف کو آرٹ بنا دیا ہے اور بعض نے آرٹ کو تکلف۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے یہاں خیال کی رعنائی بیان کی زیبائی سے بڑھ گئی ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے یہاں الفاظ و اسلوب کے حسن پر مفہوم و معنی کے حُسن کا دھوکا ہوجاتا ہے۔ کوئی اپنے اندازِ تحریر سے ہمیں متاثر کرجاتا ہے اور کوئی متاثر کرنے سے زیادہ مرعوب کرڈالتا ہے۔ کوئی اپنی انفرادیت سے ہمیں چونکاتا ہے اور کوئی اپنی انفعالیت سے رلاتا ہے۔ غرض کہ جتنے انشا پرداز اتنے ہی اسالیب اور جتنے اسالیب اتنا ہی تنوع ——— تنوع شخصیت کا، صلاحیت کا اور سلیقۂ اظہار کا۔ تنوع کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور دل آویزی بھی کسی نہ کسی مقدار میں ہر انشا پرداز کے یہاں ملے گی۔ لیکن بات کہنے کا جو انداز رشید صاحب کو نصیب ہوا ہے وہ دوسرے

تمام انشا پردازوں کے طریقے سے مختلف ہے۔ ان کا انداز بیان کم سے کم آراستہ ہونے کے باوجود اپنے اندر زبان زد عام اشعار یا ضرب الامثال کا سا حسن و لطف رکھتا ہے۔ دوسرے انشا پردازوں کو پڑھتے وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ بات یا یہ خیال بڑے خوبصورت پیرایہ میں ادا کیا۔ لیکن رشید صاحب کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات یا یہ خیال اسی طرح ادا ہونا چاہئے تھا اور بس ـــــ اسلوب کی معراج یہی ہے کہ یہ بات ضرب المثل بن کر رہ جائے۔

جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے میرے نزدیک رشید صاحب کی سب سے بڑی خوبی و خصوصیت یہی ہے کہ وہ صرف بات کہنے کے قایل نہیں۔ وہ بات کو دل میں اتار دینا بھی کافی نہیں سمجھتے۔ ان کے یہاں اسلوب کا مصرف یہ ہے کہ بات بیک وقت دل میں اتر جائے اور زبان پر چڑھ جائے۔ یہ کام بہت ہی مشکل ہے اور گمان ہوتا ہے کہ اس مشکل کو سر کرنے کے لئے رشید صاحب کچھ اہتمام نہ کرتے ہوں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ رشید صاحب اپنے خیالات و افکار کے اظہار میں اہتمام کو ذرا بھی راہ نہیں دیتے۔ کم از کم ان کے انداز بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں کی شاعری یا فلاں کی تحریر بہت بے ساختہ ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ وہ شاعری یا وہ تحریر پڑھتے وقت حد درجہ بے تکلف اور بے ساختہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ اور بات کہ لکھنے والے کو اس بے تکلفی اور بے ساختگی کے پیدا کرنے میں بڑی ریاضت کرنی پڑی ہو۔ ادب میں نہ تو ہر سادہ عبارت کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لکھنے میں کاوش نہیں کی گئی اور نہ ہمیشہ مرصع عبارت کے متعلق یہ فرض کر لینا درست ہوگا کہ یہ عبارت یقیناً کاوش کا نتیجہ ہے فرانس کی ادیبہ Colette کے بارے میں سمرسٹ ماہم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

"میرا خیال ہے کہ آج کل فرانس میں اس سے زیادہ طبع پذیر انداز میں کوئی نہیں لکھتا اور اس کی عبارت میں اتنی بے ساختگی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص باور نہیں کر سکتا کہ وہ لکھنے میں ذرا بھی کاوش کرتی ہوگی۔ لیکن میں اس کی زبان سے یہ سن کر حیران رہ گیا کہ وہ ہر چیز کو بار بار لکھتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ بعض اوقات وہ صرف ایک صفحے پر اپنی پوری صبح صرف کر دیتی ہے"۔

دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد کی مثال ہے۔ وہ بارہا اس بات کا ثبوت دے چکے ہیں کہ جیسے مرصع جملے وہ لکھتے ہیں، ویسے ہی تقریر میں بول بھی سکتے ہیں۔ غرض کہ کوشش کی انتہائی کاوش کے باوجود اس کی تحریروں میں کاوش کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اور مولانا آزاد کی ہر تحریر میں اہتمام کا گمان ہوتا ہے خواہ وہ کتنی ہی قلم برداشتہ کیوں نہ لکھی گئی ہو۔ لہٰذا میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ رشید صاحب فی الواقع اہتمام کرتے ہیں یا نہیں لیکن انکے مضامین پڑھتے وقت معلوم ایسا ہی ہوتا ہے جیسے لکھنے والے نے یہ عبارت بغیر سعی و کاوش کے لکھی ہے۔ چنانچہ مجھے ان کی تحریریں پڑھنے کے دوران میں "حسن بے پروا" کی ترکیب اکثر یاد آتی ہے۔ لیکن ان کی نگارشات میں "حسن بے پروا" کے باوجود الفاظ کا بہت ہی صحیح اور حیرت انگیز انتخاب ملتا ہے بعض اوقات ان کا صرف ایک لفظ پورے ماحول اور سارے حالات کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ علامہ اقبال کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"اقبال جو کچھ کہتے تھے رازداں کی حیثیت سے کہتے تھے۔ ہم مغرب کا نام لے کر جب اور جس طرح چاہتے تھے مشرق کو سنگسار کر دیتے تھے۔ لیکن اقبال کے کہے کو کس طرح ٹال سکتے تھے جو ہم سے زیادہ یورپ کو پرکھ چکے تھے"۔

یہاں "سنگسار" کا لفظ کس قدر برمحل ہے۔ مغرب کے اثر سے مشرق کی طرف اہل مشرق کا جو رویہ تھا اس کی مصوری کے لئے 'سنگسار' کا لفظ رشید صاحب ہی استعمال کر سکتے تھے۔ پھر یہ لفظ نہ صرف خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے بلکہ بڑی بے تکلفی سے بھی۔ اکبر الہ آبادی کے متعلق رشید صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

"اکبر نے اردو شاعری کے ساتھ جتنی بے تکلفی برتی ہے ان سے پہلے شاید ہی کسی نے برتی ہو۔ انھوں نے جو موضوع چاہا اختیار کر لیا، جو زبان چاہی استعمال کر ڈالی۔ جو لہجہ جی میں آیا اختیار کیا ..... زبان، اسلوب اور موضوع ہر اعتبار سے وہ ہر طرح کے جذبات و خیالات کے اظہار پر قادر تھے۔ اس لئے کہ وہ ہر بات نہ صرف یہ کہ فی الفور اور براہ راست کہہ دیتے تھے بلکہ کہنے کے بجائے اسے سامنے لا کھڑا کرتے تھے"۔

میرا خیال ہے کہ اردو نثر کے ساتھ جتنی بے تکلفی رشید صاحب نے برتی ہے ان سے پہلے اور خود ان کے دور میں کسی اور نے ہرگز نہیں برتی

اکبر کی طرح رشید صاحب نے بھی جو موضوع چاہا اختیار کر لیا یا آل انڈیا ریڈیو دہلی کی خاطر اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن موضوع کو ہمیشہ اپنی گرفت میں رکھا۔ خود کبھی موضوع کی گرفت میں نہ آئے۔ جہاں سے جی چاہا مضمون شروع کر دیا اور بہکنے کے باوجود عنوان اور موضوع کو ایکدم سرے سے بے تعلق نہ ہونے دیا۔ پھر جس موضوع کے متعلق جو بات بھی کہنا چاہا اسے کم سے کم لفظوں میں جلد سے جلد کہدیا بلکہ اکبر کی طرح کہنے کی بجائے اسے سامنے لا کھڑا کیا۔ یہ باتیں جو میں کہہ رہا ہوں ان کی صحت کا صحیح اندازہ صرف رشید صاحب کی تحریریں پڑھنے سے نہیں ہو سکتا۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ آپ ایک ہی موضوع پر اور پھر دیکھیں کہ جو چیز دوسروں کے یہاں موج نفس کی حیثیت رکھتی ہے وہ رشید صاحب کے یہاں نکہتِ گل کس طرح بن جاتی ہے۔ آیئے اس قسم کے تقابلی مطالعے کا سامان میں ہی فراہم کئے دیتا ہوں۔ اقبال کے متعلق پہلے ایک ایسے ادیب کی چند سطریں ملاحظہ فرمایئے جو دورِ حاضر کے نہ صرف بڑے نقادوں میں سے ہے بلکہ ایک خاص اسلوب کا مالک بھی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو قعرِ مذلت سے نکال کر رفعتِ فلک پر پہونچانے کے لئے اقبال نے تعلیماتِ اسلام کا زینہ اختیار کیا۔ مگر یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ یہ نسخہ تو پرانا ہے اور مسلمانوں کو مرض پستی سے نجات دلانے کے لئے مصلحین اسلام نے بار بار یہی مداوا تجویز کیا۔ مگر اس کا حاصل کچھ نہ ہوا۔ کتنے خطیبوں، واعظوں اور مقرروں نے منبر پر کھڑے ہو کر ان الفاظ کو دہرایا ہے کہ مسلمانو! تمہاری پستی و ذلت کا سبب صرف یہ ہے کہ تم نے احکام اسلام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ تم تعلیماتِ اسلامی سے بے بہرہ ہو گئے ہو۔ تم نے خدا اور رسول کی نافرمانی پر کمر باندھی ہے۔ اگر تم پکے اور سچے مسلمان بن جاؤ، اگر تم سلف صالحین کے نقشِ قدم پر چلنے لگو تو آج پھر تم دنیا میں سربلندی حاصل کر سکتے ہو۔ پھر ایک بار دنیا کے تخت و تاج تمہارے قدموں پر پڑے ہوں گے۔ مگر ان گرما گرم تقریروں نے مسلمانوں کے بجھے ہوئے دلوں میں کبھی حرارتِ زندگی پیدا نہیں کی۔ پھر آخر کیا بات ہے کہ اسی پرانی اسلامی تعلیم کو اقبال مسلمانوں کے ہر درد کا علاج سمجھ رہے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ اسی سے مسلمانوں کی مُردہ رگوں میں خونِ زندگی دوڑے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ شریعت کے احکام ہوں یا بزرگانِ دین کے اقوال، جب ہم انھیں اقبال کے سوا کسی دوسرے کی زبان سے سنتے ہیں تو ہمارے دل پر خاک بھی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن وہی باتیں جب اقبال کے اشعار کا جامہ پہن کر ہم تک پہونچتی ہیں تو ہم تڑپ اٹھتے ہیں۔ جھومنے لگتے ہیں اور ان کا ایک ایسا نقش ہمارے دل پر مرتسم ہو جاتا ہے جو آسانی سے نہیں مٹ سکتا۔"

کتنی شستہ و شگفتہ عبارت ہے، نوک پلک سے درست۔ زبان و بیان کی خامیوں سے پاک۔ لطف و لطافت سے بھرپور۔ لیکن اب ان ہی باتوں کو رشید صاحب کے الفاظ میں دیکھئے :۔

"اقبال نے زیادہ تر وہی باتیں کہی ہیں جو قرآن و حدیث میں ہیں۔ ائمہ کے اقوال میں ہیں۔ بزرگوں کے کارناموں میں ہیں۔ اب بھی ہمارا حال یہ ہے کہ مگر ہم نے کہیں یا سنیں کہ قرآن میں یہ آیا ہے، رسول کا یہ ارشاد ہے، بزرگوں نے یہ فرمایا ہے تو ہم پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن بالکل انھیں باتوں کو جب اقبال اپنی زبان سے اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں تو ہم وجد میں آجاتے ہیں۔ اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ اسکی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس کی آڑ پکڑتے ہیں۔ اور اس پر اڑ جاتے ہیں۔ یہ آخر کیوں؟ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہمارے ذہن و دماغ کے گوشے اور زاویے ہیں۔ بعض چھپے ہوئے تار جب کوئی پہونچا ہوا ان کو پہچان کر چھیڑ دیتا ہے تو پھر زندگی اور عمل کے نغمے بیدار ہو جاتے ہیں اور بنداٹے ہوئے سوتے کھل جاتے ہیں اور ہم فوراً محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم بھی کچھ ہیں اور بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

رشید صاحب کی اس عبارت کو تقابل کی روشنی میں دیکھ کر مجھے غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے :۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اور اگر مجھے مندرجہ بالا دو عبارتوں میں کسی ایک کا اقتباس دینا ہو تو میں رشید صاحب ہی کی عبارت کو ترجیح دوں گا۔ اس لئے نہیں کہ وہ عبارت رشید صاحب کی ہے اور رشید صاحب میرے محبوب ادیب ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ رشید صاحب نے اس عبارت میں جو باتیں جس قدر سادگی، بے ساختگی اور ایجاز و اختصار کے ساتھ یاد رہنے اور رکھے جانے والے انداز میں کہہ دی ہیں وہ باتیں اس طور پر دوسرے صاحب کے یہاں ادا نہ ہو سکیں حالانکہ جس طور پر

انھوں نے وہ باتیں ادا کی ہیں وہ بھی خوبیوں سے خالی نہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ رشید صاحب کے جن خیالات کا اظہار دوسروں کے یہاں ملتا ہے یا دوسروں کے جن خیالات کا اظہار رشید صاحب کے یہاں ملتا ہے ان میں جہاں تک اظہار کا تعلق ہے بانکپن کے اعتبار سے بازی رشید صاحب ہی کے ہاتھ رہتی ہے۔ کسی بات یا خیال کو ان سے پہلے دو ہزار شخصوں نے کیوں نہ بیان کیا ہو لیکن جب اسی بات یا خیال کو رشید صاحب بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نفس خیال کے اعتبار سے وہ بات جس کی بھی ہو حسن بیان کے اعتبار سے اس پر سب سے زیادہ حق رشید صاحب کا ہے۔ اور اگر کہیں اس بات کا حوالہ دینا ہو تو سب سے پہلے انھیں کے جملوں کی طرف نظر جائے گی کیونکہ اردو میں ان سے زیادہ حوالہ دینے کے انداز میں بات کہنے والا کوئی اور نہیں۔ میں اپنے اس خیال کی تائید و توضیح کے لئے دو ایک مثالوں کی مدد ضرور لونگا۔ quotable Manner

اردو میں عوامی ادب کی ضرورت اور افادیت پر بہتوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے اس باب میں کسی کا انداز اتنا دلنشیں نہیں جتنا رشید صاحب کا اس عبارت میں ہے:

"اگر آپ غور کریں تو اس بات کا پتہ آسانی سے چل جائے کہ اب تک ہمارے شعر و ادب میں مخصوص سانچوں میں ڈھلی ہوئی مخصوص چیزیں ہی راہ پاتی رہی ہیں۔ جن سے ہم اکتانے لگے تھے۔ اسلوب بیان اور موضوع دونوں میں اس درجہ یکسانیت اور باسی پن آگیا تھا کہ جس سے بعض یہ سمجھنے لگے تھے کہ "یہی لکھنا" اور "یونہی لکھنا" مقصود بالذات ہے۔ لیکن نالے کی طرح زندگی بھی پابند نے نہیں۔ نئے ادب نے ہم کو بعض بڑی اچھی چیزیں بھی سجھائی ہیں جن کو اب ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کچھ اور نہیں تو یہ کیا کم ہے کہ ہمارے ادب میں جو ایک کمی نہایت درجہ نمایاں تھی اس کو یہ پورا کر رہا ہے۔ مثلاً اردو میں پریم چند سے پہلے غریبوں کا ادب مفقود تھا۔ حسن ہو، محبت ہو بہادری ہو، عصمت ہو، سچائی ہو، قابلیت ہو، غرض ہنسنا بولنا، رونا دھونا، مرنا جینا، آداب تسلیمات، تو تو میں میں، سب کے سب طبقۂ اولیٰ یا امرا سے متعین ہوتے تھے۔ سب کچھ "تجمل حسین خاں" کے لئے تھا۔ غریبوں یا عوام کو اتنا بھی مسرت نہ تھا کہ "خاں صاحب کی نظر بد سے محفوظ رہیں"۔

ان چند سطروں میں رشید صاحب نے جو کچھ جتنی خوبصورتی سے کہہ دیا ہے وہ دوسروں کے یہاں چند صفحوں میں بھی اتنی خوبصورتی کے ساتھ نہ ملیگا رشید صاحب کا فن واقعی غزل کا فن ہے۔ ان کی تحریروں میں نثر کی وضاحت اور صراحت کم، اور غزل کا ایجاز و اختصار اور رمز و ایما زیادہ ہے۔ ان کا آرٹ سطروں کو صفحوں میں پھیلانے کا آرٹ نہیں بلکہ صفحوں کو سطروں میں سمیٹ لینے کا آرٹ ہے۔ مجھے اس موقع پر رشید صاحب کا ایک جملہ یاد آرہا ہے جسے میں نے مدتوں پہلے کسی صاحب کے مضمون میں دیکھا تھا۔ یوپی والوں کی وضعداری اور قدامت پرستی کی بہت سی داستانیں آپ نے پڑھی ہوں گی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رشید صاحب کا یہ ایک جملہ ان تمام داستانوں پر بھاری رہے کہ "یوپی والے ہوا کے رخ پر اتنی نظر نہیں رکھتے جتنی ان چیزوں پر جو ہوا کی زد میں ہوتی ہیں"۔ رشید صاحب کے یہاں اس قسم کے فقرے کثرت سے ملتے ہیں۔ میں ایسے فقروں کو "مضمون طلب" فقرہ کہا کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ مضمون طلب فقرہ لکھنے میں جتنا اور جیسا کمال رشید صاحب کو حاصل ہے اتنا اور ویسا کمال اردو میں شاید ہی کسی اور کے حصہ میں آیا ہو ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ رشید صاحب کا اندازِ بیان اوروں سے زیادہ حوالہ دئے جانے کے قابل (quotable) ہوتا ہے اس کی دو ایک مثالیں اور بھی دیکھ لیجئے۔

اردو غزل پر حسرت موہانی کے احسانات طرح طرح سے بیان کئے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں یہ بات تقریباً ہر ایک نے دہرائی ہے کہ بیسویں صدی میں غزل کی نشاۃ الثانیہ حسرت کی رہینِ منت ہے۔ دیکھئے رشید صاحب اس بات کو کتنے چبھتے ہوئے انداز میں کہتے ہیں:-

"..... یہ کہنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ حسرت کا غزل پر بڑا احسان ہے اور میرے نزدیک جس کا غزل پر احسان ہے اس کا پوری اردو شاعری اور اردو زبان پر احسان ہے۔ حسرت نے غزل کی آبرو اس زمانہ میں رکھ لی جب غزل بہت بدنام اور ہر طرف سے نرغے میں تھی۔ انھوں نے اردو میں غزل کی اہمیت اور عظمت ایک نامعلوم مدت تک منوالی"۔

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ میں صرف رشید صاحب کی طرفداری میں بات کر رہا ہوں۔ اس کا کیا ثبوت کہ اوپر کی عبارت میں رشید صاحب نے

حسرت کے متعلق جو بات کہی ہے وہ کسی دوسرے ادیب نے بھی کہی ہے اور اگر دوسرے نے کہی بھی ہے تو اس کا انداز اتنا چبھتا ہوا نہیں جتنا رشید صاحب کا ہے۔ میں آپ کی اس بدگمانی کے جواب میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی ایک عبارت کا اقتباس دینے سے بہتر اور کچھ نہیں کر سکتا۔ ان کی عبارت یہ ہے :-

"انھوں (حسرت) نے نہ صرف غزل کو از سر نو زندہ کیا اور اس کو اس کی کھوئی ہوئی آبرو واپس دی بلکہ اس کو ایک نیا وقار بخشا۔ حالی کی اصلاح و ترغیب کے باوجود غزل کی اصلاح و ترقی کی طرف کسی کا دھیان نہیں جا رہا تھا اور ہم کو کسی طرف سے امید نہ تھی کہ اردو غزل سنبھالا تو خیر کیا کوئی نئی کروٹ بھی لے گی ـــ یکایک ہمارے کان غزل کی ایک نئی آواز سنتے ہیں جو ہر لحاظ سے نئی تھی مگر کسی اعتبار سے بھی اس کو بدعت یا بدراہی نہیں کہہ سکتے ـــ یہ حسرت کی آواز تھی"

حسرت ہی کے متعلق رشید صاحب کے دو جملے اور بھی سن لیجئے۔ لیکن ان جملوں میں جو بات کہی گئی ہے اسے پہلے آل احمد سرور کے لفظوں میں دیکھ لیجئے سرور لکھتے ہیں :-

"ان کا حسن و عشق، ان کے ہجر و فراق سب اسی دنیا کی چیزیں ہیں۔ مگر انھوں نے ان میں ایک ابدی چاشنی بھر دی ہے اور زمان و مکان سے بے نیاز کر دیا ہے۔ حسرت نے عام حالات و واقعات بیان کئے ہیں..... حسرت نے گھریلو فضا کے حسن کو دیکھا ہے اور اس دنیا کی عورت میں حور آسمانی کا تقدس اور جمال دکھایا ہے"

تقریباً انھیں باتوں کو رشید صاحب یوں بیان کرتے ہیں :-

"انھوں (حسرت) نے اپنی عاشقی کو قضیۂ زمین بر سر زمین ہی رکھا۔ اس کو نہ آسمان پر لئے پھرے۔ نہ ویرانوں میں بھٹکنے دیا انھوں نے اپنے عشق کو نہ گاؤں سدھار کا حلیہ بنایا نہ بغاوت اور انقلاب کا وسیلہ۔ نہ یزداں اور اہرمن کا مسئلہ۔ حسرت اور جگر دونوں اصلاً اسی دنیا کے محبوب کی موجودگی میں اور ہجر محبوب کی دوری پر غزل خواں ہوتے ہیں"

اب تک رشید صاحب کے جتنے اقتباسات دئے گئے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ جن خیالات و افکار کے اظہار میں رشید صاحب کا قلم درمیان میں آیا وہاں بڑے بڑے چراغوں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اور یہ بات زیادہ حیرت انگیز اس لئے معلوم ہوتی ہے کہ ان کے یہاں نہ زبان کی نمائش ہے اور نہ بیان کے پیترے۔ وہ جس بات کو جن الفاظ و انداز میں کہہ دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں الفاظ و انداز میں وہ بات نہ صرف ان کے ذہن میں آئی ہو گی بلکہ وہی الفاظ و انداز اس بات کے لئے سب سے زیادہ فطری اور سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے فقروں اور جملوں کی جو خوبی یا خصوصیت پڑھنے والوں کو یا کم از کم مجھے زیادہ محظوظ و متاثر کرتی رہی ہے وہ ان کے فقروں اور جملوں کا اچھوتا پن ہے۔ رشید صاحب کی ساری بے تکلفی و بے ساختگی اور اہتمام و التزام سے بے نیازی کے باوجود ان کے فقروں اور جملوں میں ایک عجیب سی originality کا احساس ہوتا ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ یا اس انداز و ساخت کا جملہ رشید صاحب ہی لکھ سکتے تھے۔ اس لفظ یا اس انداز و ساخت تک دوسروں کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اردو کے دوسرے انشا پرداز اپنی تحریروں کی مجموعی فضا سے پہچانے جاتے ہیں۔ رشید صاحب تقریباً اپنے ہر جملے یا ہر جملے کے دو ایک لفظوں کی آڑ سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات ان کے فقروں اور جملوں کی originality کا سارا دار و مدار دو ایک لفظوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ جملہ آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ "ہم مغرب کا نام لے کر جب اور جس طرح چاہتے تھے مشرق کو شرمسار کر دیتے تھے"۔ اس میں صرف ایک لفظ 'شرمسار' نے پورے جملہ کو original بنا دیا ہے۔ لگے ہاتھوں رشید صاحب کی دو ایک ایسی عبارتیں بھی دیکھتے چلئے جن کی ندرت کا انحصار فقروں اور جملوں کے انداز و ساخت پر ہے۔ ایک جگہ اکبر کے متعلق لکھتے ہیں :-

"انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز (تقریباً پچاس سال تک) کی ہماری پوری داستان، حوصلہ و ہوس کی، الفت و آمیزش کی، پیش قدمی و پسپائی کی، شور و سکوت کی، سود و زیاں کی، اکبر کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ کہیں خفی، کہیں جلی، کہیں شگفتہ، کہیں حزیں لیکن ہر جگہ دل نشیں۔ اس عہد کے شعار اور شعور کو سمجھنے کے لئے اکبر کے کلام سے ہر طرح کی مدد لی جا سکتی

ہے۔ شاید اتنی قیمتی مدد اور کہیں سے حاصل بھی نہیں ہوسکتی۔

شاعر کے کلام میں زمانہ اور زندگی کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ لیکن اکثر وہ نقوش اتنے واضح اور اتنے جیتے جاگتے نہیں ہوتے جتنے اکبر کے۔ دوسروں کے یہاں اس طرح کے نقوش دریافت کرنے پڑتے ہیں۔ بڑی چھان بین، بڑی اُلٹ پھیر، اکثر خواہ مخواہ کی خوش عقیدتی یا سوءظن کو دخل دینا پڑتا ہے۔ اکبر کے یہاں یہ بات نہیں۔ ہر بات پوری ولدیت، قومیت، سکونت پیشہ، اور حلیہ کے ساتھ کہیں قانونی آہنگ میں، کہیں شاعرانہ رنگ میں، کہیں تراش خراش کے ساتھ، کہیں جوں کی توں، کہیں روایتی، کہیں انقلابی۔"

ایک جگہ ذاکر صاحب کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"ذاکر صاحب کے تین اور بھائیوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ یہ خاندان تقریباً بارہ سال تک علی گڑھ کی رزم و بزم میں پورے طور پر بے نقاب رہا۔ وہ بھی اس زمانہ میں جب علی گڑھ اپنے طنطنہ و دبدبہ کے نصف النہار پر تھا۔ جب یہاں دوسرے درجے کی کوئی بات معاف نہیں کی جاتی تھی اور ہر شخص کی ہر حرکت ایسی میزان میں تلتی رہتی تھی جو بڑی ہی بے درد بے خطا تھی ....."

حسرت موہانی سے متعلق بھی ایک عبارت دیکھتے چلئے :۔

"شادی اور غم کی ان کے ہاں شاید کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ ان کو فطرت کے ان مظاہر سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے جو حلقۂ شام و سحر میں اسیر تھے۔ آئے اور چلے گئے۔ آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے نہ ان کو معلوم کہ وہ کیا ہیں۔ کیوں ہیں۔ کیونکر۔ کہاں کے۔ اور کب تک۔ نہ ہم کو۔ جس طرح حلقۂ شام و سحر میں ہم اسیر ہیں حلقۂ حسرت میں شاید رنج و راحت، نفع و ضرر اور خیر و شر اسیر تھے کہیں ایسا تو نہیں کہ حسرت کی دنیا و عقبیٰ حسرت خود تھے اور کون اپنی دنیا و عقبیٰ خود نہیں ہے۔"

میں نے رشید صاحب کی عبارتوں کے صرف اچھوتے پن کو واضح کرنے کے لئے اتنے اقتباسات دیدئے ہیں۔ لیکن ان عبارتوں میں صرف اچھوتا پن ہی تو نہیں ؟

"ذاکر صاحب" والے مضمون میں ذاکر صاحب کی تقریر کے متعلق رشید صاحب نے لکھا ہے کہ :۔

"..... ہر طرح کے تکلفات سے قطعاً بری، رواں، چنچی تلی، دل نشیں، فکر انگیز انگریزی تقریر میں نے ذاکر صاحب ہی کی زبانی سنی۔ ان کی تقریر کا ایک جملہ بھی زاید از ضرورت نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک استوار، شریفانہ۔ اور ہر فقرے میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ آپ ان کے کسی فقرے کے ابتدائی الفاظ سن کر یہ نہ بتا سکیں گے کہ اس فقرے کی یہ پرداخت ہوگی یا یوں ختم ہوگا ہمیشہ وہ اس کو اس طرح ختم کریں گے کہ آپ متحیر بھی ہوں گے اور خوش بھی۔"

میں نے نہ کبھی ذاکر صاحب کو دیکھا اور نہ کبھی ان کی تقریر سنی۔ اور ان کی تھوڑی بہت تحریریں جو میری نظر سے گزری ہیں ان میں مجھے وہ سب خوبیاں نظر آئیں جنھیں رشید صاحب ان کی تقریروں کا خاصہ بتا رہے ہیں۔ لیکن اگر ذاکر صاحب کی انگریزی تقریروں کے متعلق رشید صاحب کی رائے حرف بہ حرف صحیح ہے تو مجھے کہنے دیجئے کہ اُردو ادب میں ذاکر صاحب کی انگریزی تقریروں سے ملتی جلتی جو چیز ہے وہ صرف رشید صاحب کی تحریریں ہیں۔ یہاں میں دو باتوں پر خصوصیت کے ساتھ زور دینا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ رشید صاحب کی رائے ہر جگہ چنچی تلی ہو یا نہ ہو لیکن وہ انداز و الفاظ بڑے جنچے تلے ہوتے ہیں جن میں وہ رائے ظاہر کی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ رشید صاحب کے فقرے کے ابتدائی الفاظ کو سن کر یا پڑھ کر اس کے آخری الفاظ یا انداز کا اندازہ اتنا ہی مشکل ہے جتنا ان آخری الفاظ یا انداز سے پیدا ہونے والی حیرت اور مسرت یقینی ہے۔ میں نہیں جانتا آپ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے یا نہیں لیکن میں اس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ممکن ہے رنگینی و رعنائی، شستگی و شگفتگی، لطف و لطافت اور زور و وقار کے اعتبار سے اُردو کے دوسرے انشا پردازوں کا پلہ رشید صاحب سے بھاری ہو لیکن جہاں تک فقروں اور جملوں کی طرفگی و تازگی اور اندازِ بیان کی برجستگی و بے ساختگی کا تعلق ہے رشید صاحب اپنا جواب آپ ہیں۔

رشید صاحب کے یہاں ایک اور چیز ملتی ہے جو کم از کم مجھے دوسروں کے یہاں نظر نہیں آئی۔ وہ یہ کہ ان کی جو باتیں جتنی زیادہ گہری اور اہم ہوتی ہیں انھیں وہ اتنے ہی سرسری اور ضمنی طور پر کہہ جاتے ہیں وہ ان باتوں کو کہنے یا ان پر زور دینے کے لئے خود نہیں رکتے لیکن وہ باتیں پڑھنے والے کو ضرور روک لیتی ہیں۔ مثلاً :-

"شاعری اصناف سخن میں نہ کبھی قید ہوئی ہے نہ ہوسکتی ہے۔ زندگی کے بدل جانے سے شاعری کی وضع قطع، موضوع، اسلوب و انداز کا بدل جانا بھی کوئی قیامت نہیں۔ ایسا ہوتا رہا ہے، ہونا چاہئے اور ہو کر رہے گا۔ وضع قطع اور موضوع بھی شاعری نہیں ہے۔ شاعری کو وضع قطع میں محدود کر دینا رسم ہے اور موضوع میں مقید کرنا پروپگنڈا۔ مجھے دونوں میں سے کسی ایک پر بھی فخر نہیں۔

اس عبارت کے آخر میں کتنے پتے کی بات کہی گئی ہے لیکن کس قدر سرسری طور پر!

رشید صاحب کے فکر و فن کے سلسلہ میں آسکر وائلڈ، چسٹرٹن اور برنارڈ شا کے اثرات کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی سوئفٹ کا نام بھی لے لیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ان کے فکر و فن کو سوئفٹ سے کوئی علاقہ نہیں۔ رشید صاحب جیسے آدمی کے فکر و فن میں اس دراکی و دل خراشی اور اس خشونت و خشم گینی کی گنجایش نکل ہی نہیں سکتی جو سوئفٹ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ وہ دنیا کے بے ہنگم پن اور دنیا والوں کی بے راہروی پر غمگین و غضبناک ہونے کے باوجود کبھی اپنے آپ کو اس برہمی و بیزاری کا شکار نہیں ہونے دیتے جس میں سوئفٹ کے طرز و طنز نے پرورش پائی تھی۔ رشید صاحب کی مذہبیت انھیں سوئفٹ کی سی دل آزاری و مردم بیزاری دونوں سے باز رکھتی ہے۔

جہاں تک آسکر وائلڈ، چسٹرٹن اور برنارڈ شا کے اثرات کا تعلق ہے رشید صاحب پر ان تینوں کی گرفت نمایاں ہے۔ اردو میں آسکر وائلڈ کے مقلدوں کی تعداد جتنی بھی رہی ہو لیکن اس کے فیضان کی اچھی مثالیں دو ہی ہیں۔ ایک رشید صاحب اور دوسرے نیاز صاحب۔ رشید صاحب جیسے ذہین و طباع کسی کا مقلد بن کر رہ جانا پسند نہیں کر سکتے لیکن اس کا کیا علاج کہ ان پر آسکر وائلڈ کا اثر اتنا گہرا ہے کہ بعض اوقات ان کے قلم سے شعوری یا غیر شعوری طور پر بالکل آسکر وائلڈ کے سے جملے ٹپک پڑتے ہیں۔ "ذاکر صاحب" کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"عام تقریر کرنے والوں کی مانند وہ جسم کے کسی عضو کو خاص طور پر جنبش یا جھٹکے نہ دیں گے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں ان کے سارے جسم و جان کی کارفرمائی ہے۔ " بتانا مشکل ہے کہ وہ اپنی تقریر سے اپنے گرد ویسی ہی فضا پیدا کر لیتے ہیں یا وہ خود ایک فضا ہیں جس سے ویسی ہی تقریر برآمد ہوتی ہے۔"

آخری جملے کو پڑھتے وقت آسکر وائلڈ کے مشہور ڈراما Lady Windermere's Fan کے کردار Mrs. Erlynne کے یہ جملے بے اختیار یاد آجاتے ہیں کہ :-

"London is too full of fogs — and serious people, Lord Windermere. Whether the fogs produce the serious people or whether the serious people produce the fogs, I do not know, but the whole thing rather gets on my nerves ...."

آسکر وائلڈ اور رشید صاحب کے دو متوازی جملوں کو پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ رشید صاحب آسکر وائلڈ کے جملوں کا چربہ اتارتے ہیں میں صرف آسکر وائلڈ کے اثر کی شدت کو واضح کرنا چاہتا تھا۔ جب ایک ادیب کسی دوسرے ادیب سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے تو اس کے یہاں اپنے محبوب ادیب کی بعض ادائیں آہی جاتی ہیں۔ مہدی افادی علامہ شبلی کے اسلوب و انشا پر فریفتہ تھے۔ چنانچہ ان کے یہاں اپنے مخصوص طرز نگارش کے باوجود جس پر خود شبلی کو رشک تھا شبلی کے کتنے ہی خاص الفاظ اور فقرے در آئے ہیں۔

رشید صاحب کی تحریروں میں paradox , epigram اور Self-assertion کے جو نقوش ملتے ہیں وہ یقیناً آسکر وائلڈ، چسٹرٹن اور برنارڈ شا کی دین ہیں۔ انگریزی میں یہ تینوں ادیب علی الترتیب متذکرہ خصوصیات کے امام مانے جاتے ہیں اُردو میں رشید صاحب کو ان تینوں خصوصیات کا امام ٹھہرانا تو صحیح نہ ہوگا کیونکہ جہاں تک epigram کا تعلق ہے۔ نیاز صاحب کے یہاں بھی اس کا استعمال خاصا ہے اور self assertion والی خصوصیت رشید صاحب کے علاوہ سجاد انصاری مرحوم نیاز صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں بھی نمایاں ہے۔ رہا paradox سو یہ چیز یقیناً رشید صاحب کا حصہ ہے۔ لیکن مجموعی طور پر تینوں خصوصیات کا جیسا امتزاج رشید صاحب کے یہاں ملتا ہے ویسا اور کہیں نظر نہیں آتا۔

لیکن رشید صاحب کے فکر و فن کی تشکیل و تعمیر میں صرف آسکر وائلڈ، چسٹرٹن اور برنارڈ شا کو دخل نہیں بلکہ اس کے اجزائے ترکیبی اور بھی ہیں، جن کی تحقیق و تعیین کا حق وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جنھوں نے نہ صرف رشید صاحب کو قریب سے دیکھا ہے بلکہ ان لوگوں کو بھی جن کی صحبتیں خود رشید صاحب نے اُٹھائی ہیں۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن رشید صاحب کے مرقعوں کو پڑھتے وقت مجھے بارہا محسوس ہوا ہے کہ مولانا سلیمان اشرف، مولانا اقبال سہیل، اصغر گونڈوی اور ذاکر صاحب جیسے "ہم نشینوں" کا "جمال" ان پر کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ ان کے مزاج و میلان اور زبان و بیان میں اکبر الہ آبادی کی کارفرمائی تو سامنے کی چیز ہے۔ آلِ احمد سرور کا خیال ہے کہ رشید صاحب نے سجاد انصاری کے بھی اسلوب فکر اور اسلوب بیان دونوں سے فایدہ اُٹھایا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کو رشید صاحب کے یہاں انگریزی کے مشہور ادیب اڈیسن کا بھی عمل دخل نظر آتا ہے۔ الغرض رشید صاحب کے فکر و فن کی ساخت و پرداخت میں کئی عناصر کو دخل ہے جن کا پتہ لگانے اور پتہ بتانے کے لئے ایک الگ مضمون کی بھی ضرورت ہے اور ایک خاص قسم کے مضمون نگار کی بھی ——— "خاص قسم کے مضمون نگار" سے میری مراد صرف اتنی ہے کہ وہ رشید صاحب سے بھی اچھی طرح واقف ہو اور ان لوگوں سے بھی جو رشید صاحب کے باب میں موثرات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

رشید صاحب ہندوستان و پاکستان کے طول و عرض میں بنیادی طور پر طنز نگار و مزاح نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن میں ان کے طنز و مزاح کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اگر جانتا ہوں تو صرف اتنا ہی کہ اُردو ادب میں رشید صاحب پہلے اور تنہا شخص ہیں جس نے طنز و مزاح کو فلسفہ اور فلسفہ کو آرٹ بنا دیا۔

رشید صاحب کے متعلق یہ سوال دلچسپی سے خالی نہیں کہ وہ طنز نگار پہلے ہیں یا مزاح نگار۔ آلِ احمد سرور کی رائے تھی کہ وہ طنز نگار پہلے ہیں اور مزاح نگار بعد میں۔ لیکن اب ان کی رائے اس کے برعکس ہے۔ میں اس باب میں اب بھی سرور صاحب کی سابقہ رائے کو زیادہ قرین صحت سمجھتا ہوں۔ رشید صاحب کی ہر قسم کی تحریروں میں طنز و مزاح کی دھوپ چھاؤں ضرور ملتی ہے ——— یعنی طنز کی دھوپ اور مزاح کی چھاؤں۔ حیات و کائنات کی طرف رشید صاحب جیسے شخص کا رویہ بنیادی طور پر مزاحیہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اپنے ذہن و ذوق کی ساخت و پرداخت کے اعتبار سے رشید صاحب محض ہنسنے ہنسانے پر اکتفا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے یہاں ظرافت طنز کے جلو میں آتی ہے نہ کہ طنز ظرافت کے جلو میں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو رشید صاحب کے "ابتدائی مضامین پر وجد کرتے ہیں اور بعد کی چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتے"۔ ایسوں کے بارے میں سرور صاحب کی یہ رائے بہت صحیح ہے کہ ایسے لوگ بچے پھلوں کے زیادہ شوقین ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کے رشید صاحب، شروع کے رشید صاحب سے مختلف ہو گئے نہیں البتہ "خوبتر" ضرور ہیں۔ ان کا اسلوب فکر اور انداز بیان آج بھی ویسا ہی ہے جیسا شروع میں تھا۔ لیکن جو نکھار اور بہار اب ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے اس سے ان کے ابتدائی مضامین خالی تھے۔ یہاں ابتدائی مضامین سے میری مراد "مضامینِ رشید" اور "خنداں" کے مضامین سے ہے۔ رشید صاحب کی ان کتابوں میں بہار کی بشارت موجود تھی۔ بعد کی تحریروں میں خود بہار موجود ہے۔ اب نہ صرف شروع کی خامیاں دور ہو گئی ہیں بلکہ شروع کی خوبیاں زیادہ روشن ہو گئی ہیں۔ پہلے ان کے مضمون کے بعض حصے ثقیل اور بے کیف بھی ہوتے تھے اب اس خامی کو اُن کے یہاں راہ نہیں ملتی۔ لیکن بعض باتیں اب بھی ان کے یہاں ایسی ہیں جن کو بعض لوگ خامیوں ہی سے تعبیر کریں گے مثلاً رشید صاحب کا موضوع سے الگ ہو کر باتیں کرنا، مضمون میں ترتیب و تسلسل کا نہ ہونا، بیچ میں لمبی لمبی فلسفیانہ بحثیں چھیڑ دینا اور جہاں

تہاں علی گڑھ کی فضیلت اور فضایل جتانا وغیرہ۔ ان باتوں کے وجود سے نہ رشید صاحب انکار کرسکتے ہیں اور نہ میں البتہ ان باتوں کے جواز میں کچھ انھوں نے بھی کہا ہے اور کچھ میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔

جہاں تک موضوع سے منحرف ہوکر باتیں کرنے کا تعلق ہے رشید صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میرے "مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور بہکی بہکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے عین مطابق تھیں۔ میں خود نہیں بہکتا تھا۔ دوسروں کو بہکنے بہلنے کی فرصت دیتا تھا عقل کی باتیں دیر تک نہ سنی جاسکتی ہیں نہ سنائی جاسکتی ہیں۔ میرے نزدیک رشید صاحب کا یہ اعتذار قابلِ قبول ہے۔ ویسے کسی طنز نگار اور ظرافت نویس پر یہ پابندی عاید ہونی بھی نہیں چاہئے کہ وہ ہمیشہ اپنے موضوع کی حدود میں مقید رہے Essay کی صنف اس پابندی کی متحمل ہو بھی نہیں سکتی۔ پھر جس شخص کا بہکنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں اس کا ہر گناہ قابلِ معافی ہے۔

جہاں تک رشید صاحب کے مضامین میں فلسفیانہ بحثوں کا تعلق ہے میں کہہ چکا ہوں کہ انھوں نے طنز و مزاح کو فلسفہ اور فلسفہ کو آرٹ بنا دیا ہے۔ ممکن ہے ایسا کرنے میں وہ ہر جگہ کامیاب نہ ہوئے ہوں لیکن یہ کیا ضرور کہ ان کی ناکامیوں کو پیشِ نظر رکھ کر ان پر اعتراض کیا جائے اور ان کی کامیابیوں کا اعتراف کہیں بھی نہ کیا جائے۔

رشید صاحب کے مضامین میں علی گڑھ کی فضیلت اور فضایل کی جو قصیدہ خوانی ملتی ہے ذاتی طور میں اس کا بھی بُرا نہیں مانتا جس ادارے نے خود رشید صاحب کو اور ایک پوری قوم کو بہت دیا ہو اس کی مدح سرائی میں کیا برائی؟ مجھے سرور صاحب کے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کہ "مقامی رنگ کی وجہ سے ان کی مقبولیت یقیناً محدود ہوجاتی ہے"۔ رشید صاحب نے جب کبھی اور جہاں کہیں علی گڑھ کا ذکر کیا ہے وہاں کی خاص خاص اصطلاحات و روایات کی طرف اشارے کردئے ہیں، جن کی مدد سے باہر والے بھی علی گڑھ کے افسانہ و افسوں کو نہ صرف سمجھ سکتے ہیں بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوسکتے ہیں۔ البتہ اس باب میں ایک بات محلِ نظر ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح جارج برنارڈ شا اس بات پر ترس کھاتا رہتا تھا کہ دنیا کا ہر دوسرا آدمی جارج برنارڈ شا نہیں ہے اسی طرح رشید صاحب ہر اس معقول آدمی پر ترس کھاتے رہتے ہیں جو علی گڑھ کی فیض بخشیوں سے محروم رہ گیا ہے۔ لیکن برنارڈ شا نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی تھی کہ اگر یہ دنیا برنارڈ شاؤں سے بھری ہوتی تو کس درجہ ناقابل برداشت ہوتی۔ کاش کبھی رشید صاحب بھی اس پر غور کرتے کہ پوری دنیا نہ سہی، اگر صرف ہندوستان و پاکستان کا ہر معقول آدمی "علی گڑھ مارکہ" ہوتا تو ان دونوں ملکوں کے معقول آدمیوں کی دُنیا کتنی یک رنگ و بے کیف ہوتی ہے۔

رشید صاحب کے طنز و مزاح کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور طنز و مزاح کی تخلیق میں ان کا طریق کار کیا ہے، ان پہلوؤں پر مجھ سے پہلے دوسرے لوگ تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ لیکن طریق کار کے باب میں ایک بات ایسی ہے جس کی طرف دوسروں نے غالباً اب تک توجہ نہیں کی۔ وہ یہ کہ رشید صاحب بعض ہنگامی حالات و حوادث اور تحریکات و واقعات کا حوالہ کچھ اس انداز سے دیتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ اس خصوصیت کی دو تین مثالیں دیکھتے چلئے:۔

"ہمارے نقاد کی سب سے بڑی اُلجھن یہ ہے کہ اُردو کے تمام لکھنے والے روس میں کیوں نہ پیدا ہوئے۔ ایک ایک دو دو کرکے کیوں پیدا ہوئے۔ بیک وقت سارے کے سارے کیوں نہیں۔ اور اب جبکہ ان باتوں میں سے ایک بھی وقوع میں نہ آئی تو پھر یہ تمام شاعر اور ادیب عرض البلد ۳۸ پر کیوں نہیں آجاتے"۔

"شاعری بالخصوص غزل میں الفاظ، محاورہ اور بولیوں کی آبادکاری اس طرح تو نہ ہوگی جس طرح ہندوستان اور پاکستان میں مہاجرین کی ملکیت تقسیم ہوئی ہے"۔

"... جگر صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کرلیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپے اس طرح نہ خرچ کریں جس طرح بعض حکومتیں بعض حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں"۔

رشید صاحب اس صنعت کے بہت دلدادہ ہیں جسے انگریزی میں Alliteration کہتے ہیں۔ اس صنعت کا تھوڑا بہت

استعمال ہر ادیب کے یہاں ملتا ہے، لیکن رشید صاحب اس کثرت سے اس صنعت کو بروئے کار لائے ہیں کہ یہ صنعت ان کے اسلوب کی ایک پہچان بن گئی ہے۔ اس کی مدد سے وہ نہ صرف اپنے اسلوب میں خوش آہنگی پیدا کرتے ہیں بلکہ اپنی تحریروں میں مزاح بھی۔

رشید صاحب کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریریں صرف ذہانت و فطانت کا کارنامہ نہیں ان میں وسیع علم اور گہری فکر کی کارفرمائی کو بڑا دخل ہے۔ اسی لئے ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ایسے ذہن و شعور کی ضرورت ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ بھی ہو۔

رشید صاحب کی تنقید نگاری اگرچہ کبھی کبھار کا مشغلہ ہے، پھر بھی انھیں نقاد کی حیثیت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو میں وہ اپنی طرز کے واحد نقاد ہیں ۔۔ اس خصوصیت کے ساتھ کہ ان کا طرز تنقید نہ مشرق سے مستعار ہے نہ مغرب سے مغلوب۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنے اسلوب نقد کے پیشرو بھی ہیں اور جانشین بھی۔ رشید صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"میں کسی ایسی تنقید کا قایل نہیں ہوں جس کے سانچے ڈھلے ڈھلائے پہلے سے موجود ہوں۔ بنے بنائے اصول باہر سے کمیشن پر منگانا اور کام نکل جانے پر کارخانہ کو واپس کر دینا تنقید نہیں نالائقی ہے۔ شاعری کا کوئی کارخانہ نہیں ہوتا جہاں فرمایش کی چیزیں بالکل نپی تلی ایک ہی طرح کی بے شمار تعداد میں نکلتی ہوں۔ شاعری مشینی عمل نہیں ہے۔ شخصی کردار ہے جس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے تنقید کے اصول اتنے ضروری نہیں ہوتے جتنا خود شاعر کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

یہ عبارت رشید صاحب کے نظریۂ تنقید کی ترجمان ہے اور ان کے تنقیدی مضامین اس نظریہ پر ان کے عمل کی نمایندگی کرتے ہیں۔ رشید صاحب تنقید و تبصرے میں دوسروں کا سہارا لینے یا حوالہ دینے کے قایل نہیں۔ یہ بات بہت کم نقادوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم چیز جو رشید صاحب کو دوسرے تمام نقادوں سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین معلومات افزا ہونے سے زیادہ بصیرت افروز ہوا کرتے ہیں۔ وہ کسی ادیب یا شاعر کے متعلق یہ نہیں بتاتے کہ وہ کن حالات میں پیدا ہوا اور کن مجبوریوں کے ماتحت جاں بحق ہو گیا۔ یا کوئی ادبی تحریک کس انقلاب کی پیداوار تھی اور کن حادثات کا شکار ہو کر رہ گئی۔ ان کے مضامین ادیبوں، شاعروں، تحریکوں اور خطروں کے متعلق رموز و نکات کی بالا ہوا کرتے ہیں جس میں زندگی، زمانہ، تہذیب، تمدن اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں کے بارے میں ان کے اچھوتے اور انوکھے خیالات کے موتی جگمگا رہے ہوتے ہیں۔ میں ان کے تنقیدی مضامین کو اس خیال سے کبھی نہیں پڑھتا کہ ان سے زیر بحث ادیب یا شاعر کے بارے میں مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا جو اس کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ معلومات کے لئے میں دوسرے نقادوں کے پاس جاتا ہوں، بصیرت کے لئے رشید صاحب کے پاس آتا ہوں۔ آپ اسے میرا راز یا میری کمزوری سمجھیں کہ مجھے اپنے دل و دماغ میں جتنی آسودگی اور بالیدگی، جتنی روشنی اور گرمی رشید صاحب کے مضامین کو پڑھ کر محسوس ہوتی ہے اتنی اُردو میں کسی اور کے مضامین کو پڑھ کر محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مجھے رشید صاحب سے ہر جگہ اتفاق ہے۔ رشید صاحب کی بعض رائیں ایسی ہوتی ہیں جن سے رشید صاحب کے سوا اور کوئی اتفاق نہیں کر سکتا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اختلاف کس سے نہیں ہوتا اور غلطیوں سے کون مبرا ہے۔ جب نقد و انتقاد کے بانی و بابا آدم افلاطون و ارسطو سے اختلاف کیا جا سکتا ہے تو پھر دوسروں کا ذکر ہی کیا ہے۔ بعض ادیبوں اور شاعروں کے متعلق اگر کسی نقاد کی رائیں لائقِ اعتماد نہیں، ہیں تو نہ سہی دیکھنا یہ چاہئے کہ مجموعی طور پر وہ شعر و ادب اور زندگی کے متعلق ہماری بصیرت میں کس حد تک اضافہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مجھے رشید کا رتبہ بہت بلند نظر آتا ہے۔ انھوں نے بہت سے ادبی اور فکری مسایل پر اظہار خیال کیا ہے اور بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں سرور صاحب نے لکھا ہے کہ رشید صاحب کو نئے خیالات سے خدا واسطے کا بیر تو نہیں مگر وہ اس نئے پن کو پوری طرح ہضم نہیں کر پاتے ۔۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے، لیکن رشید صاحب جس طرح اپنے حافظہ کی کمزوری کے باوجود برمحل شعر کا حوالہ دینے میں خاص کمال رکھتے ہیں اسی طرح نئے خیالات کے علم برداروں اور نئے ادب کے پرستاروں سے جو باتیں کہی ہیں وہ بڑی حد تک معقول بھی ہیں اور مفید بھی۔ رشید صاحب

ادب اور زندگی کے رشتہ کے قایل ہیں اور ادیب و ادب پر عوام کے حقوق کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر وہ اسے پسند نہیں کرتے کہ ادب ہندوستان کا ہو اور زندگی ماسکو کی۔ یا ادب میں ادیب کے سوا ہر کس و ناکس کی جلوہ گری پائی جائے یا ہر کس و ناکس کو شعر و ادب کے جواہر پاروں سے کھیلنے دیا جائے۔ ان کے اس قول میں بہت کچھ صداقت بھی ہے اور وزن بھی کہ :۔

"اچھا اور بڑا شاعر کسی مخصوص طبقہ کا شاعر نہیں ہوتا۔ وہ ہر طبقہ اور ہر عہد کا شاعر ہوتا ہے۔" اشتراکی نظام" کا اچھا اور بڑا شاعر اتنا ہی قابل قدر اور قابل فخر ہوگا جتنا کسی اور نظام کا اچھا اور بڑا شاعر خواہ وہ نظام آج سے ہزاروں سال پہلے تھا یا ہزاروں برس بعد آئے۔"

اسی طرح ان کا یہ خیال بھی صحت و صداقت سے دور نہیں کہ " آرٹ ہو یا ادب اس کا کاروبار قطعاً ذاتی اور انفرادی ہوتا ہے۔" اس خیال سے نہ تو میراجی کے ہم مشربوں کو مسرور ہونا چاہئے اور نہ سردار جعفری اور ان کے ہم قافلوں کو مایوس۔ کیونکہ رشید صاحب کے نزدیک شعر و ادب میں نہ تو انفرادیت کے معنے اُس دھندلکے میں اسیر رہنے کے ہیں جس میں میراجی اور ان کے ہم مشرب اسیر ہیں اور نہ اجتماعیت کے معنی اس تہلکے اور تبلیغ کے ہیں جس میں سردار جعفری اور ان کے رفقائے راہ مصروف و مبتلا ہیں۔ وہ شعر و ادب میں انفرادیت اور اجتماعیت کو متوازی اور متوازن رکھنے کے قایل ہیں اور اس اصول کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اگر رشید صاحب نے ایک طرف اس کا مطالبہ کیا ہے کہ " شاعر کی ڈفلی بھی اپنی ہو اور راگ بھی اپنا" تو دوسری طرف انھوں نے یہ بھی کہدیا کہ :۔

"میں ادب، آرٹ اور زندگی سب کو علٰحدہ علٰحدہ اور بہ حیثیت مجموعی بھی صرف سلیقہ، شرافت اور سرفروشی سمجھتا ہوں ....."

"ادب انسانیت سے خارج نہیں ہے اور انسانیت کا کوئی ایسا مفہوم نہیں ہے جس کو آپ کچھ اور سمجھتے ہوں۔ ہم کچھ اور انسانیت کو انسانیت ہی کہتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔"

"ذہنی دُنیا میں رہنا یا داخلی شاعری کی آڑ پکڑنا میرے نزدیک یکسر مہمل ہے اگر شاعر اپنے آپ کو خارج سے بے نیاز کرلے اور خارج کو توڑنے مروڑنے اور سلجھانے سنوارنے میں خون پسینہ ایک نہ کردے یا نہ کر سکے۔"

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ رشید صاحب شعر و ادب میں انفرادیت اور اجتماعیت کا ایسا امتزاج دیکھنا چاہتے ہیں جس کے بغیر کسی کا شعر و ادب نہ منفرد بن سکتا ہے نہ مفید۔

رشید صاحب الفاظ و اسلوب کے عمدہ پارکھ، روایات و رجحانات کے بالغ نظر نقاد اور شعر و ادب کے بڑے اچھے مزاج داں ہیں۔ انکی تنقیدی تحریریں اُردو ادب کے تنقیدی سرمایہ میں قابلِ قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سرور صاحب نے ان کی تنقید نگاری کے متعلق ایک بات یہ کہی ہے کہ "تنقید میں اگرچہ انھوں نے کبھی کبھار کسی اچھی چیز کی تعریف نہ کی، لیکن آج تک میں نے ان کی کوئی ایسی تنقید نہ دیکھی جس میں کسی پست اور ناقص کارنامے کو انھوں نے سراہا ہو۔" یہ بات صحیح نہیں۔ رشید صاحب نے بعض پست اور ناقص چیزوں کو سراہا ہے یا سراہنے پر مجبور کردئے گئے ہیں۔ یہاں میں مثالیں نہ دوں گا کیونکہ ان سے ان لوگوں کو تکلیف پہونچے گی جنھوں نے اپنے پست اور ناقص کارناموں پر رشید صاحب سے اچھی رائے لکھوالی ہے۔ مگر رشید صاحب کا یہ گناہ اس لئے قابلِ معافی ہے کہ خود سرور صاحب اور اُردو کے دوسرے نقادوں کے "شہر" میں اس گناہ کا ارتکاب بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ سرور و اشتشام جیسے سنجیدہ و برگزیدہ نقاد بعض لوگوں کے مہملات و مزخرفات کی تعریف و توصیف میں جس فیاضی سے کام لے رہے ہیں اس پر انھیں شرم آتی ہو یا نہیں لیکن میرے ایسے عقیدت مند کو یقیناً شرم آنے لگی ہے۔

رشید صاحب کی مرقع نگاری ان کی مزاح نگاری سے کچھ کم مقبول نہیں۔ بلکہ بعض لوگوں کو ان کی مرقع نگاری ان کی مزاح نگاری سے

زیادہ محبوب ہے ۔ یہاں میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ وہ مرقع نگار کی حیثیت سے زیادہ اچھے اور بڑے ادیب ہیں یا طنز نگار و مزاح نگار کی حیثیت سے ۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ رشید صاحب نے جس صنف ادب کو چھوا اس میں نہ صرف ایک نئے اسلوب کی طرح ڈال دی بلکہ خود ہی اس اسلوب کے سارے امکانات کو تکمیل تک پہونچا دیا ۔ میں رشید صاحب کو ادب کی کسی بھی صنف پر حرف آخر نہیں مانتا لیکن انھوں نے جس صنف میں جو رنگ اختیار کیا اس کے حرف اول اور حرف آخر وہ ضرور ہیں ۔ یہی حال ان کی مرقع نگاری کا بھی ہے ۔ رشید صاحب کے مرقعوں کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ۔ "گنج ہائے گرانمایہ" اور "ذاکر صاحب" اور اگر "شیخ نیازی" کو بھی مرقع نگاری کے صنف میں شمار کیا جائے (اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسا نہ کیا جائے) تو اس اعتبار سے ان کے مرقعوں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں ۔ ان کے علاوہ رشید صاحب نے حسرت ، جگر ، اقبال سہیل ، اور شفیق الرحمن قدوائی کے جو مرقعے لکھے ہیں وہ ابھی تک رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں ۔ رشید صاحب کے ان مضامین اور مجموعوں سے پہلے بھی اردو میں مرقع اور خاکے لکھے جا چکے تھے اور اب بھی لکھے جا رہے ہیں ادب کی اس صنف کو اردو ادب کی بعض بہت بڑی شخصیتوں کا التفات حاصل رہا ہے اور اسی لئے اردو میں مختلف و متنوع اسالیب کی مرقع نگاری وجود میں آچکی ہے ۔ لیکن ان میں جس قدر لطف انگیز و دل آویز اسلوب رشید صاحب کا ہے اتنا اور کسی کا نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی مرقع نگاری نسبتاً زیادہ مقبول رہی ہے ۔

رشید صاحب نے جن شخصیتوں کے مرقعے لکھے ہیں ان سے انھیں صرف ذہنی دلچسپی نہیں بلکہ جذباتی وابستگی بھی رہی ہے ۔ اسی لئے ان مرقعوں میں وہ بے تعلقی (detachment) نہیں پائی جاتی جو سائنٹفک مرقع نگاری کے لئے نہایت اہم شرط ہے ۔ اردو میں سائنٹفک مرقع نگاری کے اچھے نمونے فرحت اللہ بیگ ، عصمت چغتائی اور منٹو کے یہاں ملتے ہیں ۔ فرحت اللہ بیگ کے مضمون "نذیر احمد کی کہانی میری زبانی" عصمت چغتائی کا مضمون "دوزخی" اور منٹو کے کئی مضامین اس فن کارانہ بے تعلقی اور بے رحمی کے ترجمان ہیں جو سائنٹفک مرقع نگاری کی بنیادی خصوصیت قرار دی گئی ہے ۔ لیکن رشید صاحب کا فن ان فن کاروں سے مختلف بھی ہے اور زیادہ دل پذیر بھی ۔ مرقع نگاری کے متعلق ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ :-

"آپ کا کسی سے خوش ہونا یا ناخوش ہونا آپ کے لئے جتنا آسان ہے اتنا ہی یہ مشکل ہے کہ آپ اس شخص کو میری پسند یا ناپسند کا موجب بنا دیں ۔"

مرقع نگاری میں رشید صاحب کا فن کسی شخصیت سے مسرور و متاثر ہو کر اسے ہماری آپ کی پسند کا موجب بنا دینے کا فن ہے ۔ "ذاکر صاحب" اور "گنج ہائے گرانمایہ" میں جن شخصیتوں پر جس انداز سے مضامین لکھے گئے ہیں اس سے والے کی محبت کا ہیجان اور شخصیت کا عرفان دونوں نمایاں ہیں ۔ ان کتابوں کے موضوعات انسان سے زیادہ ان اقدار و فضایل کے مجسمے معلوم ہوتے ہیں جنھیں رشید صاحب عزیز رکھتے ہیں اور جنھیں وہ ہر دل عزیز بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں ۔ ان کے یہاں قدر دل اور شخصیتوں کا ربط بڑا گہرا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشید صاحب ان دونوں کا جواز ایک دوسرے میں ڈھونڈھتے اور پاتے ہیں اور اگر وہ دونوں ایک دوسرے کا جواز نہ ہوتے تو رشید صاحب ان میں سے کسی کے قایل نہ ہوتے ۔ بایں ہمہ ان کے مرقعے جاندار بھی ہیں اور جانفزا بھی ۔ دلکش بھی ہیں اور دلکشا بھی ۔ ان مرقعوں کے موضوعات قارئین کو اپنا رازدار بنائے بغیر ان کے رفیق بن جاتے ہیں ۔ قارئین پر اعتماد نہ کرنے کے باوجود ان پر اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں ان مرقعوں میں جن شخصیتوں کی تصویریں ہیں ان سے میری آپ کی ملاقات ہمیشہ جلوتوں میں ہوتی ہے ۔ خلوتوں میں کبھی نہیں ۔ لیکن ان کو جلوتوں میں دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان کے یہاں خلوت کے معنی ہرگز اس "کار دیگر" کے نہ ہوں گے جس کے لئے ہم سبھی ایک دوسرے کی خلوت میں جھانکنے کے درپے رہا کرتے ہیں ۔

یہاں میں اس تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا کہ رشید صاحب نے کن شخصیتوں پر کیا لکھا ۔ ان کی کن خوبیوں کو روشنی میں لائے اور کن خصوصیتوں کو سائے میں رکھا ۔ لیکن شاہ سلیمان صاحب اور ذاکر صاحب کے سلسلہ میں دو ایک باتوں کی وضاحت ضروری ہے ۔ سرور صاحب نے لکھا ہے کہ :

"رشید صاحب ، ذاکر صاحب سے بھی متاثر تھے اور مولانا سلیمان اشرف سے بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ذاکر صاحب کے ساتھ

زیادہ دور تک نہ جا سکے۔ مگر ذاکر صاحب کا یہ احترام ان سے یہ محبت اور خلوص ظاہر کرتا ہے کہ ان کا دل کس طرف ہے۔
پھر بھی یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ ان کے سلیمان اشرف پر مضمون میں جو عظمت و جلال ہے وہ ذاکر صاحب والے مضمون میں کیوں نہیں۔"

اِس "کیوں نہیں" کے جواب میں پہلی بات مجھے یہ کہنی ہے کہ ذاکر صاحب والے مضمون میں ان کی عظمت یقیناً نمایاں ہے۔ البتہ جلال کا احساس نہیں ہوتا جس کی وجہ یہ ہے کہ ذاکر صاحب کی شخصیت ہی میں جلال نہیں ہے۔ ذاکر صاحب سے متعلق مضامین سے جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں ان کی شخصیت سرتاسر جمالی ہے۔ اس لئے ذاکر صاحب والے مضمون میں جلال کی جستجو ہی بے معنی ہے۔ رہا یہ سوال کہ رشید صاحب، ذاکر صاحب کے ساتھ زیادہ دور تک نہ جا سکے تو اس باب میں سرور صاحب کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ رشید صاحب اپنی محبوب شخصیتوں میں کس کے ساتھ دور تک گئے؟ ۔ انھوں نے جو مرقعے لکھے ہیں ان سے جہاں دوسروں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا ہے وہاں خود رشید صاحب کے متعلق بھی اتنی بات تو معلوم ہو ہی جاتی ہے کہ وہ زیادہ دور تک نہ مولانا سلیمان اشرف کا ساتھ دے سکتے تھے نہ ذاکر صاحب کا۔ نہ فرزانگی کا ساتھ دے سکتے ہیں نہ دیوانگی کا۔ رشید صاحب کی شخصیت کو پرکھنے کا یہ معیار صحیح نہیں کہ انھوں نے کتنی دور تک کس کا ساتھ دیا۔ دراصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ کس کی داد کس حد تک دے رہے ہیں۔ جب آپ اس نقطۂ نظر سے انھیں جانچیں گے تو یہ پائیں گے کہ وہ دیوانوں کا ساتھ نہ دے سکنے کے باوجود زیادہ قایل دیوانوں ہی کے ہیں کیونکہ بقول ان کے "اگر دیوانے نہ ہوں تو فرزانے کہیں کے نہ رہیں۔" پھر یہ بات بھی نظر میں رکھنے کی ہے کہ رشید صاحب، سلیمان صاحب متاثر جس قدر بھی ہوئے ہوں لیکن انھوں نے اپنا مرشد ذاکر صاحب ہی کو بنایا۔

ذاکر صاحب والے مرقعے پر سرور صاحب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ:۔

"'ذاکر صاحب'، نہ رشید صاحب کا بہترین کارنامہ ہے نہ ذاکر صاحب کی بہترین تصویر۔"

ایک دوسری جگہ سرور صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"ذاکر صاحب پر رشید صاحب کی چھوٹی سی کتاب ممدوح کی شخصیت کی جامع تصویر نہیں ہے۔"

ان دونوں جملوں کو ایک ساتھ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر سرور صاحب کے نزدیک "ذاکر صاحب" ذاکر صاحب کی بہترین تصویر نہیں ہے تو اس لحاظ سے کہ وہ ان کی جامع تصویر نہیں ہے۔ لیکن یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ سرور صاحب ایک مرقع میں اس جامعیت کی جستجو کیوں کرتے ہیں جس کا حق صرف سیرت (Biography) میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"ذاکر صاحب کی عظمت کا راز صرف دوست کا دل رکھنے میں نہیں قوم کی آبرو رکھنے میں ہے ..... رشید صاحب نے اس بات پر توجہ نہیں کی کہ ذاکر صاحب کی شخصیت کی عظمت محض ان کی ذہانت، خلوص، تقریر و تحریر کے کمال، علم و عمل کی صلاحیت، زندگی اور زندہ دلی میں نہیں، ان کی ایک نصب العین کی تلاش اور اس تلاش کے لئے وقف ہو جانے میں ہے۔"

اس عبارت کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرور صاحب جن باتوں کا ذکر کر رہے ہیں یا جن باتوں کی طرف توجہ دلا رہے ہیں ان سے ذاکر صاحب کا مرقع خالی ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ "ذاکر صاحب" کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آجاتا ہے کہ وہ دوست کا دل رکھنا بھی جانتے ہیں اور قوم کی آبرو رکھنا بھی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ایک خیال کو عمل، ایک تصور کو تحریک اور ایک خواب کو حقیقت بنا دینے سے عبارت ہے۔ البتہ اس مرقع سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ قوم کی آبرو رکھنے میں خود ذاکر صاحب کہاں کہاں بے آبرو ہوتے ہوتے بچے اور جس خواب کو انھوں نے حقیقت بنا دیا ہے اس کو حقیقت بنانے میں انھیں کن مسایل اور مراحل سے گزرنا پڑا۔ لیکن کیا یہ تفصیلات مرقع نگاری کی حدود سے باہر نہیں ہیں؟

سرور صاحب اس بات پر برہم نظر آتے ہیں کہ "ایک ایسے قومی نظام کی تشکیل جس کے انقلابی امکانات اب جا کر تسلیم کئے جا رہے ہیں

سرور صاحب کی مراد بنیادی تعلیمی اسکیم کی رپورٹ سے ہے جسے ذاکر صاحب نے رشید صاحب کے مکان پر بیسیوں ملاقاتیوں سے ملنے جلنے، بات چیت کرنے کے باوجود ایک ہفتے میں مرتب کیا تھا۔ اس کام میں خلل اندازیوں کو دیکھ کر رشید صاحب نے ازراہ مذاق کہا:۔ "مرشد! یہ کہاں کا کھڑاگ پھیلایا ..... تمام دن خدائی خواروں یا حق بخشوائے ہوئے لوگوں کا مجمع رہتا ہے" اور جس نے ذاکر صاحب کی شہرت کو عالمگیر بنا دیا ہے کتاب میں خدائی خواروں یا حق بخشوائے ہوئے لوگوں کے مجمع سے یاد کی گئی ہے۔

سرور صاحب کی یہ برہمی قطعاً بیجا ہے۔ اس لئے کہ رشید صاحب نے ذاکر صاحب کے مرقع میں نہ تو اس انقلابی امکانات والے قومی نظام کی توہین کی ہے اور نہ اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ذاکر صاحب کتنے بڑے کام کو کتنے چھوٹے چھوٹے کاموں اور لایعنی مصروفیتوں کے ہجوم میں کتنی خوش دلی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس بات کو واضح کرنا ذاکر صاحب کی شخصیت کے ایک اہم پہلو کو واضح کرنا ہے۔ رہا خدائی خواروں اور حق بخشوائے ہوئے لوگوں والا فقرہ سو یہ صرف مزاح ہے اور مزاح کا برا ماننا خوش مذاقی کے منافی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "ذاکر صاحب" ذاکر صاحب کی بہترین تصویر بھی ہے جو اب تک ہمارے سامنے آئی ہے اور رشید صاحب کے بہترین کارناموں میں سے ایک کارنامہ بھی۔ بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ جو ماڈل مصور کو سب سے زیادہ پسند آئے یا سب سے زیادہ متاثر کرے اسی کی تصویر کشی میں وہ ناکام رہے۔ بڑی شخصیتوں کے جتنے مرقعے رشید صاحب نے لکھے ہیں ان میں "ذاکر صاحب" سب سے زیادہ طویل ہے۔ ذاکر صاحب کی صد رنگ شخصیت کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ایسا ہو جو اس مرقع میں اسیر نہ کر لیا گیا ہو۔ مرقع نگاری میں زیر مطالعہ شخصیت کے حالات کی بجائے اس کی سیرت کے خصوصیات پر اور کارناموں سے زیادہ کردار پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی بقول اختر انصاری:۔ "آپ کو ذاکر صاحب کے حالات کہیں نہیں ملیں گے مگر ذاکر صاحب ہر جگہ ملیں گے"۔

رشید صاحب طبعاً دل آویز شخصیتوں کے پرستار واقع ہوئے ہیں۔ مگر وہ شخص کی پرستش شخص کو شخص ہی سمجھ کر کرتے ہیں نہ کہ خدا یا بت سمجھ کر۔ وہ جس کی پرستش کرتے ہیں اس کی خامیوں کی طرف اشارہ نہیں کرتے (اسی لئے رشید صاحب کے تمام مرقعے یک رخے ہیں) مگر اس کی خوبیوں کا ناطہ خدا یا بتوں کے اوصاف سے نہیں جوڑتے، رشید صاحب کی یہ خصوصیت ان کے تمام مرقعوں کی طرح "ذاکر صاحب" میں بھی موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ شعر کی شرح سے زیادہ مشکل شخصیت کی شرح ہے۔ رشید صاحب نے "ذاکر صاحب" والے مضمون میں شخصیت کی شرح کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ اردو ادب میں ہمیشہ اپنا جواب طلب کرتا رہے گا۔ یہاں ایک اقتباس دئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ دیکھئے رشید صاحب ذاکر صاحب کی عظیم و حسین شخصیت کے گوناگوں اوصاف کو کتنے دل آویز و دل نشیں انداز میں بیان کرتے ہیں:

> "ذاکر صاحب جامعہ کو ۲۵ سال سے چلا رہے ہیں۔ اس دوران میں جامعہ اور جامعہ میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ دونوں پر مسلسل اور بے پناہ غیر شریفانہ حملے ہوئے۔ لیکن نہ یہاں کوئی اسٹرائک ہوئی۔ نہ کوئی بد دل ہوا۔ نہ جامعہ کو چھوڑ کر شہرت یا روزی کمانے کہیں اور گیا۔ یہاں ایسے لوگ بھی نہ تھے جن پر رزق اور موت کے دروازے بند رہے ہوں۔ اور جامعہ کے علاوہ کہیں اور ٹھکانا نہ ہو۔ بلکہ ان میں سے اکثر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ایسی شہرت رکھتے تھے کہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں ان کی پذیرائی احترام کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ یہ صرف ذاکر صاحب کی بلند و برگزیدہ شخصیت تھی جس نے جامعہ کے تار و پود کو نہ صرف بکھرنے سے بچایا بلکہ اس کو مربوط و مستحکم کر دیا"۔

جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور ذاکر صاحب کیا ہیں۔ سارا قضیہ اسی ترازو میں تل کر ختم ہو جاتا۔ ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا، اپنے ایثار، قربانی اور اخلاقی فضایل کا کسی کو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و نجابت یا

سوشل اور سرکاری تعلقات یا رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سردار خاندانی اعتبار سے بھی درخالص ہے اور اس کے تعلقات بھی زیادہ وقیع، زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں محنت کرنے اور فرایض سے عہدہ برآ ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذاکر صاحب جیسا محنت شاقہ کرنے والا اور اپنے فرایض پر آرام و تفریح کو قربان کر دینے والا حلقے میں ان جیسا کوئی اور نہ تھا۔ کسی کو اپنے ذوق ذہانت و فطانت کا دھیان ستاتا تو وہ دیکھتا کہ اس وادی میں بھی امام ذاکر صاحب ہی ہیں۔ کلرک یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں چپراسی یہ پاتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ دوڑ دھوپ اُٹھاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں بچہ یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب جیسا بچہ کوئی نہیں۔ جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں اور بوڑھا یہ جانتا کہ جب بڑھاپا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا ہے تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے۔

ان کے علاوہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے فایدے کے لئے جان کھپاتے ہیں۔ اس کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد اور اس کی عزت و فراغت کو اپنی عزت و فراغت سمجھتے ہیں تو پھر کون ایسا ہو سکتا تھا جو ذاکر صاحب کو چھوڑ کر اپنے ضمیر کی سرزنش گوارا کرتا۔"

رشید صاحب نے جن شخصیتوں کے مرقعے لکھے ہیں ان میں بعض ایسی بھی ہیں جن کے مرقعے دوسرے ادیبوں نے بھی لکھے ہیں مثلاً مولانا محمد علی پر رشید صاحب کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریابادی اور قاضی عبدالغفار نے مضامین لکھے ہیں۔ ذاکر صاحب پر رشید صاحب کے علاوہ ڈاکٹر عابد حسین نے لکھا ہے۔ احسن مارہروی اور محفوظ علی بدایونی پر رشید صاحب کے علاوہ پروفیسر ضیا بدایونی نے بھی لکھا ہے جن کا شمار ادیبوں سے زیادہ فاضلوں میں ہوتا ہے۔ باقی لوگ یعنی عبدالحق، عبدالماجد، عبدالغفار اور عابد حسین جس پایہ کے ادیب و انشا پرداز ہیں اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر آپ مشترک موضوعات پر رشید صاحب اور ان ادیبوں کے مرقعوں کا تقابلی مطالعہ کریں تو ایک بات ضرور محسوس کریں گے۔ وہ یہ کہ زیر مطالعہ شخصیتوں کے ذہن و ذوق، ظرف و لیاقت، سلیقہ و شرافت، عظمت و رفعت، جمال و جلال، وزن و وقار، بے نفسی و ایثار، خلوص و خودداری، خدمت و اُلفت، دیوانگی و فرزانگی اور دوسرے اوصاف کے جیسے واضح، روشن اور مؤثر نقوش رشید صاحب کے مرقعوں کو پڑھ کر ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں ویسے دوسروں کے مرقعوں کو پڑھ کر نہیں ہوتے۔ خواہ ان کے لکھنے والے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں۔ یہاں پہونچ کر یہ بات مان لینا پڑتی ہے کہ انشا پرداز و مرقع نگار کی حیثیت سے رشید صاحب چھوٹوں میں بڑے نہیں بلکہ بڑوں میں بڑے ہیں۔

رشید صاحب کے مرقعوں کو پڑھتے وقت مجھے ایک بات بارہا محسوس ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ رشید صاحب صرف طنز نگار، مزاح نگار، تنقید نگار اور مرقع نگار نہیں بلکہ شاعر اور مصور بھی ہیں ——— جذبات و کیفیات کے شاعر اور ماحول و منظر کے مصور ——— ان کی شاعری اور مصوری اگر ادنیٰ یا اوسط درجے کی ہوتی تو میں ہرگز ان کا ذکر نہ کرتا لیکن رشید صاحب کی شاعری اور مصوری تو اس انداز و معیار کی چیز ہیں جس کی بلندیوں تک پہونچنے میں بہت سے پیشہ ور شاعروں اور مصوروں کا دم پھول جائے گا۔ آپ دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ میں حد درجہ مبالغے سے کام لے رہا ہوں۔ لیکن اس بدگمانی کی کیا ضرورت۔ دو ایک مثالیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ میں تو اقتباس دینے کا عادی ہوں ہی۔ میرا خیال ہے اس وقت تک آپ بھی اقتباسات سننے یا پڑھنے کے خوگر ہو چکے ہوں گے۔ محمد علی والے مضمون میں رشید صاحب لکھتے ہیں:۔

"محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے۔ لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ ہماری قومی زندگی میں آج کتنے دھارے بہہ رہے ہیں۔ کتنے چشمے اُبل رہے ہیں۔ کتنے عزائم بیدار اور کتنی روحیں دار و رسن کی طلبگار ہیں۔ یہ کس کا فیضان ہے۔ محمد علی نے ہمارے خون کو رگوں میں دوڑنا پھرنا ہی نہیں بتایا بلکہ وہ آج خود ہماری آنکھوں سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں۔ مرد غازی کے کارناموں کا اندازہ مقبوضات کی وسعت مال غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہمہمی و طرب انگیزی، برگستواں کی زینت، تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے

نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی رزم اور دمکتے ہوئے چہرے ۔۔۔ ڈوبتے ہوئے سورج سے"۔

یہ تو رہی شاعری کی مثال اور اب ایک خاص موقع کی مصوری کی مثال دیکھئے۔ حسرت موہانی والے مضمون میں لکھتے ہیں :-

"دہلی میں ایک نیم سرکاری و سیاسی قسم کا اجتماع تھا۔ بعض اہم اور نازک مسایل زیر بحث تھے۔ شام کو عصرانہ تھا۔ اعیان و اکابر جمع تھے۔ حسرت بھی مدعو تھے۔ ایسے موقع پر ایسی پارٹیاں صرف چائے پینے پلانے کے لئے نہیں ہوتیں۔ اور باتیں بھی مدنظر ہوتی ہیں۔ آرایش و زیبایش، جاہ و حشم، ساز و سامان، تکلف و تواضع، صاحبان ثروت، ماہرین سیاست، اکابر علم و حکمت، اپنے اپنے وزن اور وقار کے ساتھ اور خواتین مع اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے موجود تھیں۔ فضا آراستہ، چمن پیراستہ، اتنے میں ایک طرف سے حسرت نمودار ہوئے۔ اسی سج دھج سے جو صرف ان کی تھی۔ اسی وقار درویشی اور انداز قلندری سے جو ان کا مسلک تھا۔ اور اسی شعلہ سامانی اور شبنم افشانی کے ساتھ جو ان کی زندگی تھی۔ مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ہر شخص نے بڑے لطف و احترام سے حسرت کی پذیرائی کی اور دیکھتے دیکھتے وہ سب کی توجہ اور تپاک کا مرکز بن گئے۔ شایستہ فقرے، لطف کی باتیں، عقیدت و محبت کی پیش کش، ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ تقریب حسرت ہی کے خیر مقدم کے لئے منعقد ہوئی تھی۔ فرمایش شروع ہو گئی۔ حسرت نے شعر سنانے شروع کر دئے۔۔۔۔۔۔

حسرت اپنا کلام سنا رہے تھے۔ سارے اکابر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ تھوڑی دیر تک ذہن میں کچھ اور باتیں آتی رہیں اور اپنا اپنا نقش چھوڑتی چلی گئیں۔ سارا گرد و پیش جو دولت، امارت اور نفاست کا ترجمان اور آئینہ دار تھا۔ ایک شخص کی موجودگی سے کیا سے کیا ہو گیا اور اس مرد درویش کے جلال اور اس کی شاعری کے جلو میں وہ سارا اہتمام کس درجہ سطحی اور ضمنی معلوم ہونے لگا۔۔۔۔۔۔"

مرقع نگاری میں رشید صاحب کا انداز بیان ان کی دوسری تحریروں (مثلاً تنقید، طنز، مزاح) سے مختلف نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جب وہ مرحوم شخصیتوں پر مضامین لکھتے ہیں تو ان کے انداز بیان میں سوز و گداز اور سوگواری کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے جو موضوع کے فطری تقاضے اور ناگزیر نتیجے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن محض اس بنا پر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ رشید صاحب کے ایسے مرقعوں کا طرز ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے طرز سے بے حد ممتاز ہے۔ اور جو سطوت، برگزیدگی اور دل نشینی ان کے مرقعوں میں پائی جاتی ہے وہ ان کے دوسرے مضامین میں نہیں ملتی۔ واقعہ یہ ہے کہ رشید صاحب کا کوئی مضمون خواہ وہ طنزیہ ہو یا تنقیدی، مزاحیہ ہو یا مرقع نگاری، سطوت، برگزیدگی اور دل نشینی سے خالی نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں تنقیدی مضامین میں بھی ایسے جلے قدم قدم پر ملتے ہیں کہ :-

"میں حسن خیال اور حسن عمل کو بھی ایک دوسرے سے علحدہ دیکھنے سے معذور ہوں۔ معقول شاعر نا معقول شخص یا نا معقول شخص معقول شاعر کیسے ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی ہوتا ہو لیکن نہ وہ میرے ذہن میں آتا ہے نہ میرے دسترخوان پر آنے پائے گا۔"

اور مرحوم شخصیت کے مرقع میں بھی رشید صاحب کے یہاں ایسی عبارت جا بجا ملتی ہے کہ :-

"۔۔۔۔۔۔ علی گڑھ میں داخلے کا زمانہ بڑے ہنگامے کا ہوتا ہے۔ سارے بزرگان دین جو سال بھر ہم سب کو گالی اور اخبارات کو پیام دیتے رہتے ہیں نئے سشن کے شروع ہوتے ہی ہم کو قرون اولیٰ کا مسلمان قرار دیدیتے ہیں۔ پہلے خطوط آنے شروع ہوں گے۔ اس کے بعد تار۔ اس کے بعد تار کے "خلاصہ فریاد" ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی لڑکا آپ کا ہے۔ یونیورسٹی قوم کی ہے اور حکومت ہندوؤں کی۔ لڑکے کو داخل کرایئے۔ جتنی مراعات ہو سکیں دلوایئے، بقیہ خود پوری کیجئے۔ چال چلن اور خواندگی کی نگرانی کیجئے۔ پاس کرایئے۔ نوکری دلوایئے اور ہم دونوں کو اس وقت تک مہمان رکھئے جب تک کہ لڑکا یہاں کے ماحول سے آشنا اور خود ان سے متنفر نہ ہو جائے!۔۔۔۔۔۔ داخلے کا زمانہ عین برسات کا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے برسات میں شکم پروری اور قوم کی مرثیہ خوانی کا بیک وقت زور ہو اور کام کوئی نہ ہو تو معدہ کب تک ساتھ دیگا "والدین" میں سے کوئی پیچش میں مبتلا ہے۔ کوئی اسہال میں۔ کسی کو یونانی علاج موافق نہیں آتا۔ کسی کو ڈاکٹری دوا سے عموماً اختلاف ہے۔ کھانا ناشتہ سب کو موافق۔ حکیم صاحب کے ہاں لے جایئے یا انھیں بلایئے تو بتائیں گے موجودہ تکالیف اور علاج کرائیں گے دیرینہ ناگفتہ بہ شکایات کا ..... اس زمانہ میں اور ایسے موقع پہ ایوب مرحوم کام آتے تھے۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرقع نگاری میں رشید صاحب کا یہ اندازِ بیان ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے انداز بیان سے کس طرح مختلف اور ممتاز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بنیادی رنگ و آہنگ کے اعتبار سے رشید صاحب ادب کی ہر صنف میں ہر جگہ یکساں ہے اور وہ اسی اسلوب سے جس صنفِ ادب میں جس صنفِ ادب کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں ادا کر دیتے ہیں۔

اب کچھ "شیخ نیازی" کے بارے میں ـــــ "شیخ نیازی" رشید صاحب کے ایک بچے (جو اب یقیناً بچہ نہیں رہا) کا مرقع ہے۔ شیخ نیازی ایک بیٹے کی حیثیت سے رشید صاحب کا کارنامہ ہو یا نہ ہو لیکن ایک مرقع کی حیثیت سے یقیناً ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اُردو ادب میں اپنی قسم کا واحد کارنامہ۔ کسی بچے کی حرکات و سکنات، اس کے نشو و نما، اس کی ذہانت و حماقت اور اس کی شوخی و شرارت کی اتنی جیتی جاگتی تصویر اور جس ادب میں بھی موجود ہو اُردو میں "شیخ نیازی" سے نہ پہلے موجود تھی نہ اس کے بعد کوئی اور وجود میں آئی۔ رشید صاحب کے اس مرقع کا انداز دوسرے مرقعوں سے یقیناً مختلف ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ یہ کسی محبوب دوست یا معزز لیڈر کا مرقع نہیں بلکہ ایک شوخ و شریر بچے کا مرقع ہے اور اسی وجہ سے اس میں ظرافت کی کرشمہ کاریاں نسبتاً زیادہ ہیں۔ "شیخ نیازی" پڑھتے وقت بارہا یہ خیال میرے ذہن میں گزرا کہ اگر رشید صاحب ناول نگار ہوتے تو اُردو ناول کو کتنے جیتے جاگتے کردار مل جاتے۔ موضوع کے اعتبار سے ممکن ہے بعض لوگ "شیخ نیازی" کو ادب الاطفال سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔ خود رشید صاحب نے اس کتاب کو بچوں ہی کے لئے بچوں کے رسالہ "پیام تعلیم" (دہلی) میں لکھنا شروع کیا تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب بچوں سے زیادہ بڑوں کے پڑھنے کی چیز ہے۔ نہایت سادہ و سلیس انداز میں رشید صاحب کی حکیمانہ نکتہ سنجی یہاں بھی جلوہ گر ہے۔ اس کتاب کے بارے میں رشید صاحب اور ان کے نقادوں کا جو بھی خیال ہو ذاتی طور پر میں اسے اُردو ادب میں ایک خاصے کی چیز سمجھتا ہوں ـــــ ایک ایسی چیز جس کی شگفتگی و شادابی سدا بہار ہے۔

سرور صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ رشید صاحب کے خطوط بڑے دلچسپ ہوتے ہیں اور غالب کے بعد ہمارے خطوط کے سرمایہ میں سب سے بڑا اضافہ ہوں گے۔ ایسا ہوا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لئے کہ اب تک ان کے جو خطوط بعض اڈیٹروں کے طفیل منظر عام پر آچکے ان کے پیش نظر سرور صاحب کی بشارت ایک یقینی بشارت معلوم ہوتی ہے۔ رشید صاحب خط لکھنے کا بڑا اچھا تصور رکھتے ہیں جس کا اظہار انھوں نے اپنے مضامین میں جا بجا کیا ہے۔ اس تصور میں رشید صاحب کا "انداز گل افشانی گفتار" بھی شامل ہو جائے تو پھر کیا کہنا ـــــ لیکن میں بالفعل اس باب میں کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا اور ان کے خطوط کے اس ذکر کو انھیں کے ایک خط کے اقتباس پہ ختم کئے دیتا ہوں۔ جس زمانہ میں ڈھاکہ سے رسالہ "خاور" نکلتا تھا اس کے اڈیٹر شادانی صاحب نے رشید صاحب سے مضمون کی فرمائش کی۔ رشید صاحب نے جواب میں ایک پوسٹ کارڈ بھیجا جس میں مضمون نہ بھیج سکنے کی معذرت کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ:-

"فی الحال تو آپ مجھے کچھ دنوں کے لئے معاف رکھیں معذور سمجھ کر، پھر اللہ وہ دن بھی لائے گا جب آپ مجھے بخش دیں گے مردود قرار دے کر"

یہ بات غور طلب ہے کہ رشید صاحب کے اسلوب نے دوسرے ادیبوں کے اسلوب کو کس طور پر کس حد تک متاثر کیا ہے۔ مجھے ان کے اسلوب کو کس طور پر کس حد تک متاثر کیا ہے۔ مجھے ان کے اسلوب کا سب سے نمایاں اثر سرور صاحب کے یہاں محسوس ہوتا ہے۔ سرور صاحب کو حالی اسکول کا نقاد کہا جاتا ہے۔ نقاد کی حیثیت سے وہ حالی کے موالی سہی لیکن اسلوب و انشا کے اعتبار سے وہ قطعاً رشید اسکول کی چیز ہیں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ان کا اسلوب رشید صاحب کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ سرور صاحب ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں اور

آج ان کا اسلوب (اگر میرا اندازہ غلط نہیں) خود رشید صاحب کے اسلوب سے زیادہ مقبول ہے۔ مگر سرور صاحب کا چراغ رشید صاحب ہی کے چراغ سے جلا ہے۔ اگر رشید صاحب نہ ہوتے تو اُردو ادب صرف رشید صاحب ہی کے اسلوب و انشا سے محروم نہ رہتا بلکہ سرور صاحب کے بھی اسلوب و انشا سے اس کا دامن خالی ہوتا۔

لوگوں کو اس کا شکوہ ہے کہ رشید صاحب نے لکھنا بہت کم کر دیا ہے۔ مجھے اس کا رونا ہے کہ انھوں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ہماری دسترس میں نہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ رشید صاحب کی جو کتابیں چھپ گئیں وہ چھپ گئیں جو مضامین رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں وہ بکھرے پڑے ہیں۔ کوئی ان کی چھپی ہوئی کتابوں کو جو ایک مدت سے نایاب ہیں دوبارہ چھاپنے والا نہیں۔ کوئی ان کے بکھرے ہوئے مضامین کو کتابی صورت میں شایع کرنے والا نہیں۔ یہ بات میں کس سے کہوں اور کس کو سمجھاؤں کہ رشید صاحب کی ہر جنبشِ قلم کا ماحصل محفوظ کر لئے جانے کے لایق ہے اور ایسا نہ کر سکنا ہماری اتنی بڑی بدتوفیقی ہے جسے اُردو ادب کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

یہ بات بھی کچھ کم افسوسناک نہیں کہ رشید صاحب کی سیرت (Biography) لکھنے کی کوشش کا تو ذکر ہی کیا ہے (کہ اُردو میں نہ تو ہر بڑے ادیب کی سیرت لکھنے کا رواج ہے اور نہ کسی کو اس کا سلیقہ آتا ہے) آج تک ان کی شخصیت پر ایک جامع مضمون بھی نہیں لکھا گیا۔ اب تک رشید صاحب کی شخصیت اور ان کے فن پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سب سے اچھے مضامین سرور صاحب کے ہیں لیکن جہاں تک رشید صاحب کی شخصیت کا تعلق ہے سرور صاحب کا بھی مضمون پڑھتے وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ مرقع نگاری کے لئے ہرگز نہیں بنے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ جس ادیب کا قلم بے جان شخصیتوں میں جان پیدا کر سکتا ہے اس کی جاندار شخصیت کو لفظوں میں محفوظ کر لینے والا ہم میں کوئی نہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہر سال بیسیوں ادیب، شاعر اور نقاد پیدا کرتی ہے۔ کاش وہ رشید صاحب کے لئے ایک بازویل Boswell بھی پیدا کر سکتی!۔

رشید صاحب سے میری دل چسپی دیرینہ ہے۔ جب میں اسکول کا طالب علم تھا اسی زمانہ سے مجھے اُن کی انشا پردازی اُن کے مضامین کی طرف اور ان کی شخصیت (جس کی جلوہ گری ان کے ہر مضمون میں پائی جاتی ہے) علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف کھینچنے لگی تھی۔ میں نے ارادہ بھی کر لیا تھا کہ اسکول کے مرحلوں سے فارغ ہوتے ہی علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ لیکن میرے علی گڑھ جانے کی پہلی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں گورکھپور پہونچ گیا اور وہاں سے آئی اے پاس کرنے کے بعد جب دوسری مرتبہ علی گڑھ جانے کی کوشش کی تو میں نے اپنے آپ کو ڈھاکے میں پایا اور ابھی تک پا رہا ہوں۔ یہاں آنے کا ایک فایدہ ضرور ہوا کہ مجھے شاہد احمد صاحب مل گئے جو میری ادبی زندگی میں زبردست اثر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر آپ شاہد احمد صاحب کو میری نثر اور شاعری میں ڈھونڈھیں گے تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ انھوں نے میری نثر اور شاعری کو نہیں میرے ذہن اور فکر کو متاثر کیا ہے۔ ان کے اثر سے مجھ میں جرأتِ فکر بھی آئی اور جرأتِ اظہار بھی۔ اور یہ اتنا بڑا فیضان ہے کہ اگر میں اس سے محروم کر دیا جاؤں تو مجھے اس محرومی کا اتنا ہی افسوس ہوگا جتنا رشید صاحب کے قرب و فیض سے محروم رہ جانے کا۔ اور رشید صاحب کی فیض بخشیوں سے محروم رہ جانے کی خلش ابھی تک اس لئے تازہ ہے کہ شاہد احمد صاحب، شاہد احمد صاحب ہیں اور رشید صاحب، رشید صاحب، دونوں ایک دوسرے کا بدل نہیں ہو سکتے ہیں۔

میں نے اس مضمون میں رشید صاحب کے متعلق اپنے متفرق خیالات و تاثرات کو یکجا کر دیا ہے۔ میری آرزو ہے کہ اگر رشید صاحب کی تمام تحریریں میسر آجائیں اور ساتھ ہی اطمینان و فرصت بھی تو ان کی ادبی شخصیت کے ہر پہلو پہ جی بھر کر تفصیل سے لکھوں۔ مجھے اس کی بھی تمنا ہے کہ میں رشید صاحب پر جو کچھ تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتا ہوں وہ اُن کی زندگی میں لکھا جائے اور خود میری زندگی میں شایع ہو جائے ——— مگر کون جانے زندگی اس کا موقع دے گی بھی یا نہیں۔

ہندستانی تہذیب کا ارتقاء

(سجاد ظہیر)

سات لمبے برسوں کے بیت جانے کے بعد وطن لوٹنے پر دلی کیفیتوں اور تاثرات کا اظہار کوئی سہل کام نہیں۔ حبس و بند کے نحس و محدود دالان، محرومیوں صعوبتوں کے غم ناک دھندلکوں اور طویل سایوں سے نکل کر جب کوئی انسان کھلی ہوئی آزاد اور روشن فضاؤں میں یکایک پہونچتا ہے۔ تب اس کی آنکھوں کا چکا چوند ہو جانا اور اس کے ذہن کا کسی قدر غیر متوازن ہونا شاید فطری اور لازمی ہے۔ بہت سی وہ چیزیں جن کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں محسوس ہوتی۔ جن کی طرف ہم بالکل متوجہ نہیں ہوتے یا جن کے وجود کو ہم یوں مان کر چلتے ہیں۔ جیسے وہ ہوا اور پانی کی طرح بے دام اور بے محنت کے ہم کو ملتے ہیں اور ہمارا ان پر پیدائشی حق ہے، اب نایاب اور نادر معلوم ہونے لگتی ہیں۔

ہم ہندوستان کے جس علاقے کے باشندے ہیں وہ ہرا بھرا اور شاداب ہے۔ آسمان کا جو شامیانہ ہمارے حصے میں آیا ہے اور جسے ہم اپنے سروں پر کھنچا ہوا پاتے ہیں اس کی مصفیٰ اور پگھلی ہوئی نیلاہٹ دن کے وقت اور رات کو تاروں کی جواہری افشاں سے بھری ہوئی اس کی سیاہ اور نم کاکلیں ہمارے موسموں کی رنگین نیرنگی اور ان کا اعتدال، ہماری چاندی کی طرح اُجلی دھلی ہوئی روشنیاں اور ہمارے گہرے خواب آور سائے، کتنے اچھے اور کتنے حسین ہیں یہ سب!

حال میں مجھے اپنے دیس کی اس موہنی دھرتی کو ایک ہوائی جہاز پر سوار ہو کر اور اوپر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ برسات ختم ہو چکی تھی کاتک شروع تھا۔ کبھی کبھی بادل کے ٹکڑے ادھر اُدھر سے آکر ہمیں دھند میں گھیر لیتے تھے۔ لیکن ان میں شبنمی کیفیت زیادہ اور اودی کالی سرشاری کم تھی۔ دھوپ چھاؤں کے اس کھیل کے نیچے تا حدِ نگاہ سبز کھیتیاں، آم کے درختوں کی گپھائیں، انگوٹھی کے نگینہ کی طرح چمکتے ہوئے تالاب اور کہیں کہیں پر سانپ کی طرح بیچ کھائی ہوئی ندیاں [illegible] دکھائی دیتے تھے اور ان سب کے درمیان انسانوں کی بستیاں، گھروندوں کے مانند! لیکن ان گھروندوں سے بھی زیادہ انسان کی محنت، معیشت اور ہند کی قدیم سرزمین پر اس کی بود و باش کا احساس ان لامتناہی چوکھٹوں اور مستطیلوں اور جومیٹری کی مختلف شکلوں اور فن [illegible] اور لکیروں سے ہوتا تھا جو اس ساری زمین پر سلسلہ وار چھوٹی چھوٹی کھیتوں کے گرد کھنچی ہوئی نظر آرہی ہیں۔

کرۂ ارض کی عمر ہر جگہ اور ہر ملک میں تقریباً ایک سی ہے، لیکن پھولوں، اس کی [illegible] ایک پرانا چین دیس کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہی ہے کہ ہمارے ملک میں اس وقت تک کی معلومات کے مطابق انسان [illegible] تحلیل ہو کر اُسے آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے پہننا شروع کیا، ہم ایسی تہذیبوں سے بھی واقف ہیں جو اس سے بھی زیادہ پرانی کہی [illegible] کے ساتھ ہم کو مل سکے۔ مصر کی تہذیب ہیں۔ لیکن جو چیز بھارت اور چین کی سبھیتا کی خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں میں تہذیبی عمل کا [illegible] اس کی بہت سی لطیف [illegible] کیلیاں تو ہوتی ہیں اور زوال و عروج کے دور نظر آتے ہیں لیکن وہ کسی بھی موقع پر بالکل ٹوٹ نہیں جاتا۔ اقبال نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — باقی مگر ہے اب تک نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

آیئے آج کی رات ہم چند ان ہیروں کی تلاش کریں جن سے مادرِ وطن کی پیشانی تابناک مقبول ہے۔ حکمت، فن اور تخلیق کے بعض وہ نادر شہ پارے جن کی درخشانی اور حدت نے ہندوستان کی مخصوص روح میں لطافت اور رس پیدا کیا ہے اور جن کا ذکر بھی ایک جہانِ رنگ و بو ہے۔

یہ مناسب ہے کہ گورکھپور کی سرزمین پر سب سے پہلے ہم امن و انس کے بھکاری شہزادے سدھارت گوتم بدھا کا ذکر کریں، جس نے تقریباً ڈھائی ہزار برس پہلے تمام انسانوں کو اپنا دکھ بتایا اور پھر دکھ بھرے انچ (RNICEA) اور انت سنسار میں دکھ سے نجات پانے کا راستہ ..... یہ بتایا کہ انسان رہبانیت اور ہوسناکی دونوں سے ہٹ کر درمیان کی اخلاق حسنہ کی متوازن راہ پر چلیں۔ لیکن دنیا میں دکھ کی جڑ کیا ہے؟ بدھا نے ہمیں تعلیم دی کہ ساری کائنات تغیر پذیر ہے۔ کوئی چیز اٹل نہیں۔ ہر ہستی جو مستحکم، مطلق یا بقا کسی میل کے معلوم ہوتی ہے ہر دم بدلتی رہتی ہے اور مختلف اجزا سے مل کر بنی ہے۔ جسم، احساسات، تاثرات، ذہنی کیفیتیں، واقفیت شعور ان سب سے مل کر ہی انسان بنا ہے اور یہ تمام اجزا ہر لمحہ اور ہر پل بدلتے ہیں۔ ہم ہر لمحہ میں ایک نیا وجود بنتے ہیں۔ جس طرح ایک بڈھا اس بچے سے مختلف ہوتا ہے جب کہ وہ گود کھیلتا بچہ تھا۔ اسی طرح وہ بھی نہیں ہے جیسا کہ وہ ایک پل پہلے تھا۔ الغرض ثبات کسی کو نہیں اور دنیا میں دکھ اور درد کا بنیادی سبب یہی ہے کہ جہاں تغیر اور تبدیلی ہے وہاں ہم ثبات دیکھتے ہیں۔ حقیقت سے ناواقفیت سے بے شعوری اور جہل سب سے بڑی خرابیاں ہیں، ساتھ ہی ساتھ بدھا نے اپنے چیلوں اور معتقدوں سے یہ بھی کہدیا کہ وہ خود جو کچھ ان کو بتا سکے ہیں وہ مکمل حقیقت نہیں ہو سکتی۔ ایک بار خزاں کے موسم میں انھوں نے اپنے ہاتھ میں کچھ سوکھی پتیاں اٹھائیں اور اپنے عزیز شاگرد آنند سے پوچھا کہ ان پتیوں کے علاوہ جو ان کے ہاتھ میں ہیں کیا اور پتیاں بھی ہیں؟ آنند نے جواب دیا:۔ "خزاں کی پتیاں چاروں طرف گر رہی ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بھی بہت ہیں"

اس پر بدھا نے کہا:۔ "اسی طرح میں نے بھی تم کو صرف چند حقیقتوں سے آشنا کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ہزاروں حقیقتیں ہیں جن کا شمار مشکل ہے"

بدھا کے فلسفے کی بنیاد مادیت، تغیر اور تبدیلی پر اس کا اصرار انسان کے جسمانی اور روحانی دکھوں کو دور کرنے کے لئے شعور اور تجربہ اور اعتدال اور درمیانی راہ پر اس کا یقین آج بھی ہمارے لئے قابل قدر ہے اور میری طرح سے جو لوگ جدلی اور تاریخی مادیت کے فلسفے کو حقیقت کے انکشاف اور سماجی زندگی میں بہتر تبدیلی کا موثر ترین وسیلہ سمجھتے ہیں ان کے لئے اس میں کشش بھی ہے اور طمانیت بھی۔ اس لئے کہ یہ کوئی کم فخر اور خوشی کی بات نہیں کہ جدید سائنس اور سائنسی سمجھ جن نتیجوں پر آج پہونچی ہے اس کے دھندلے اور ابتدائی نقوش ہمیں خود اپنے وطن کے عظیم ترین انسان کی فکر میں ملتے ہیں۔

کارل مارکس نے ایک جگہ کہا ہے:۔ "میں انقلاب اس وقت ہی صاحب جب تمام دل آزاد انسان کی عزت کی خاطر بدل جائیں اور تمام ہاتھ اس عزت کے لئے بلند ہوں"

اور دلوں کی ایسی تبدیلی اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ اپنے کے ہاتھوں میں ایسی عظیم قوت اسی وقت آسکتی ہے جب وہ اپنے متفرق خیالات زمانہ اور سماج کے ان تقاضوں کو پورا کریں جن۔ عظیم اکثریت تیار تو ہو چکی ہے لیکن جن تبدیلیوں کو جلد تر لانے اور زندگی کو نئی طرح سے سنوارنے میں وہ خیالات، بھی تو ان کی ادبی شکل ہیں جو تاریخی اعتبار سے تو مر چکے ہیں لیکن جن کو بعض خود پرست اور خود پسند گروہ اور ورگ مصنوعی طور سے اور رکھنا چاہتا ہوں وہ اپنے محدود مفاد کی خاطر زندہ اور برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

بدھا کے زمانے میں بھی ورگ سنگھرش سوشن ہوتا تھا اور بدھا کی تعلیم اور بدھ مت کی تبلیغ سے نہ تو یہ سوشن ختم ہوا اور نہ طبقاتی نزاع کی جڑیں کھود کر ایک ہم ہوا۔ اس زمانہ میں انسانی معیشت اس درجہ پر پہونچی ہی نہیں تھی کہ ایسا ہو سکتا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان عدم تشدد اور رحم، عقل اور شعور، تبدیلی اور حرکت کی اس عظیم تحریک سے

ہمارے سماج میں ایسی روحانی اور مادی تبدیلیاں ہوئیں جس نے ہمارے وطن اور ہمارے وطن کے آس پاس کے دیسوں میں انسانوں کے دلوں کو پلٹ دیا اور ان کو انسانی ارتقاء کی ایک بلند تر زیادہ کشادہ اور زیادہ آزاد فضا میں پہونچا دیا۔

وہ مسلمان کلا، جسے مورخ بودھ کلا یا بدھشٹ آرٹ کہتے ہیں آج بھی اس دعوے کے ثبوت میں موجود ہے۔ سانچی اور امراوتی، بھاربت، سارناتھ متھرا اور اجنتا کے آرٹ پر اگر آپ نظر ڈالئے تو ان کے بہترین نمونوں میں زندگی، توازن، طمانیت اور گہری انسانیت کی ایسی جاذب اور زندہ لکیریں اور ابھار، قوسیں اور گوشے اور کشادگیاں ہیں جو انسان کے ذہن اور اسکی روح کو رفعت، لطافت، حسن اور پاکیزگی کا بلند ترین پیام دیتے ہیں۔

آپ میں سے بہت سے ایسے ہوں گے جنھوں نے سارناتھ میں گوتم بدھ کے اس مشہور مجسمے کو دیکھا ہوگا جس کا شمار ہمارے ملک ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے عظیم ترین آرٹ کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔ یہ بدھا کا وہ بت ہے جس میں بدھی حاصل کرنے کے بعد سارناتھ میں اپنا پہلا وعظ دیتے ہوئے بدھا کو دکھایا گیا ہے۔ ان کے سر کے گرد روشنی کا ایک بڑا ہالا ہے جس کے کناروں پر دو چھوٹے چھوٹے فرشتے آسمان سے اس حیرتناک طور پر حسین اور مطمئن پیکر کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ گول خوبصورت چہرے پر جھکی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں اور آسودہ بھرے بھرے ہونٹ بند ہیں لیکن پھر بھی جیسے وہ بول رہے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہستی ہے جس نے رنج، دکھ، درد پر قابو پاکر نفس و روح کا ایسا تزکیہ کیا ہے اور ایسا قلب مطمئنہ حاصل کیا ہے، جس کی قربت اور جس کے درشن سے انسان سکھی ہو جائے گا۔ بدھا کے برہنہ جسم ان کے دونوں ہاتھوں، سینے، پیٹ اور پیروں کے اعصاب اور فن کار نے نہیں دکھائے ہیں تاہم ان کی لکیریں اتنی پاک، صاف، متوازن اور خوشنما ہیں جن سے جسمانیت کا احساس مٹتا نہیں، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ انسان نہیں کسی اور دنیا کی ہستی ہیں بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان کا جسم اگر اسے مادی خوشنمائی، روحانی طمانیت اور ذہنی شعور حاصل ہو تو وہ کس قدر خوبصورت ہو سکتا ہے۔ اس مجسمے میں گوتم بدھا کی انگلیاں دھرم چکر مدرا میں دکھائی گئی ہیں، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ وعظ دے رہے ہیں۔ یہ انگلیاں اور ہاتھ کی ہتھیلی اتنی سبک ہیں اور ان کے خم اتنے دل کو موہنے والے ہیں کہ بدھا کے چہرے، آنکھوں اور ہونٹ کے ساتھ مل کر گویا ان میں بھی ایک خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہو گئی ہے اس مجسمے کو دیکھ کر بالکل یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کسی ایسی ہستی کا بت ہے جس نے ترک دنیا کر دیا ہے جس نے دنیا کی لذتوں اور اس کی مادی مسرتوں سے منہ موڑ لیا ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ہم کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ اگرچہ دنیا میں زوال بھی ہے، موت بھی اور رنج و دکھ بھی لیکن انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ ان سب پر قابو حاصل کر کے اسی دنیا اور اسی مادی پیکر کو سنوار کر، اسے متوازن اور روشن کر کے وہ ایک ایسی اندرونی اور بے پایاں مسرت حاصل کرے جس کی اسے پیہم جستجو رہتی ہے۔

جس عہد میں ہندوستان کی بت تراشی اور مصوری اور فن تعمیر اپنی سب سے اونچی سطح پر پہونچا یعنی گپت بادشاہوں کا عہد۔ اسی عہد میں ہندوستان کا عظیم ترین شاعر اور ڈرامہ نویس کالی داس بھی پیدا ہوا۔ انسانی فطرت کے گہرے اور سچے مطالعہ کے ساتھ ساتھ کالی داس کی شاعری میں اپنے دیس کے دریاؤں، پہاڑ، پھولوں، اس کی فضاؤں اور ان فضاؤں میں اڑتے ہوئے برسات کے نم اور رنگین بادلوں اور ان تمام مظاہر فطرت کا انسانی زندگی میں تحلیل ہو کر اسے زیادہ ثمر بار اور رسیلی اور پر رونق بنانے میں جو کمال ہے۔ وہ مشکل سے دنیا کے کسی شاعر کے یہاں اتنی خوبی اور حسن کے ساتھ ہم کو مل سکتا ہے بدقسمتی سے مجھے سنسکرت نہیں آتی اور میں نے کالی داس کو صرف ترجمے میں پڑھا ہے ظاہر ہے کہ شعر کا ترجمہ اس کی بہت سی لطیف ترین خوبیوں کو ضایع کر دیتا ہے۔ پھر بھی میگھ دوت ترجمہ میں بھی گہرا اثر ڈالتی ہے میگھ دوت کے آخر میں شاعر اپنی معشوقہ کو یاد کر کے کہتا ہے:-

"پچیلی بیلوں میں مجھے تمہارا جسم دکھائی دیتا ہے ہرنوں کی چوکنی آنکھوں میں تمہاری آنکھیں چاند میں تمہارا چہرہ ناچتے موروں کے پروں میں تمہارے بال دریا کی چھوٹی چھوٹی لہروں میں تمہاری ترچھی لٹیں لیکن افسوس میری محبوب ایسی کوئی چیز مجھے نہیں ملتی جو بالکل

تمھاری طرح ہو!"

سنسکرت کا وافر ادب جو مہابھارت اور رامائن سے شروع ہوتا ہے (اگر ہم ویدوں اور اپنشدوں کو فی الحال ادب کے زمرے سے علٰحدہ رکھیں) اور جو مدھیہ کال تک مختلف شکلوں اور مختلف قسم کی تخلیقوں کے روپ میں ہم تک پہونچا ہے، یقینی اپنے تنوع اور معنویت کے لحاظ سے ہماری چکر کے بہترین خزانوں میں سے ہے۔ ہم نے اوپر کالی داس کی غنائیہ اور عاشقانہ شاعری کا ذکر کیا۔ اس کے ڈراموں کی عظمت بھی مسلم ہے اس کے تین سو سال بعد ساتویں صدی عیسوی کا ایک بڑا شاعر بھرتری ہری ہے جس کی چار سطری نظموں (سنسکرت کی رباعیاں) میں دنیاوی سوجھ بوجھ عشق اور تیاگ کے مضامین کے نہایت دلچسپ نمونے ملتے ہیں۔ بھرتری ہری کہتا ہے:

"تم جرأت کر کے ایک گھڑیال کے جبڑے سے ہیرا چھین سکتے ہو،
تم سمندر کے طوفانی لہروں کے باوجود اسے تیر کر پار کر سکتے ہو،
اور تم ایک غضبناک سانپ کو پھول کی طرح اپنے بالوں کو سجا سکتے ہو،
لیکن تم ایک مورکھ کو مطمئن نہیں کر سکتے جو اپنی ہٹ پر اڑ جائے!"

گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد افغانستان، وسطی ایشیا اور ایران سے نئی قوموں کے ہندوستان میں آنے کے بعد ہمارے وطن کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کا اثر ہمارے ملک کی زبانوں کے ارتقاء ہمارے ادب ہماری سنگیت اور مصوری، ہمارے فن تعمیر، ہمارے لباس اور رہن سہن، ہمارے سوچنے کے طریقوں اور ہماری ذہنی اور روحانی زندگی پر بہت دور رس اور گہرا پڑا یعنی مختلف قوموں کی لڑائیاں۔ حملہ۔ تشدد اور تصادم ایک بری اور بڑی تکلیف دہ چیزیں نہیں ہیں جیسا کہ مولانا حالی نے اپنی نظم حب وطن میں کہا ہے:۔

ملک روندے گئے ہیں پیروں سے　　چین کس کو ملا ہے غیروں سے

لیکن یہاں پر اپنی تاریخ کے اس پہلو سے ہمارا سروکار نہیں۔ جس کی اہمیت بہر حال اب صرف تاریخ کی کتابوں تک محدود ہونا چاہئے وہ حاکم اور وہ محکوم صدیوں پہلے ختم ہو چکے ہیں۔ ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ تقریباً آٹھ سو سال کی تعمیری کاوش میں وہ بہت اہم شمار کئے جانے کے لائق ہے۔

آج کل بعض ناسمجھ یا متعصب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ اس زمانہ کے حکمرانوں کا مذہب اسلام تھا اور چونکہ وہ باہر سے آکر یہاں بسے تھے اور یہاں پر انھوں نے اپنی حکومتیں قائم کی تھیں اس لئے ہمارے اس دور کے آرٹ کے نمونے "خالص" ہندستانی نہیں۔ ایسی ذہنیت صرف اُن لوگوں کی ہو سکتی ہے جو تاریخی عمل کی حرکت سے ناواقف ہیں اور جو یہ نہیں جانتے کہ دنیا کی کوئی قوم یا اس کی تہذیب خالص نہیں ہوتی اور تہذیب کا عروج اور اس کی ترقی تاریخی اعتبار سے صرف ایسے حالات میں سب سے زیادہ ہوتا ہے جب مختلف تہذیبی دھارے اور خیالات ایک دوسرے سے آکر ملتے ہیں ایک دوسرے کو سیراب کرتے ہیں اور پھر اپنے خاص ماحول اور خاص سرزمین میں اس کی تمام گزشتہ اچھی خصوصیات کو لے کر کسی نئی اور ایسی چیز کی تعمیر کرتے ہیں جو اس قوم یا ملک کی نئی ضرورتوں، اس کی نئی خواہشوں اور حسین ترین خوابوں کا اظہار کرتی ہے۔

تاج محل متفقہ طور پر ہمارے ملک کی سب سے حسین عمارت مانی جاتی ہے اور بالکل بجا طور پر اس کا شمار دنیا کے گنتی کے عظیم ترین تعمیری شاہ کاروں میں ہے۔ وہ حسن اور محبت کا ایک ایسا دل کو لبھانے والا خواب ہے جس نے سفید سنگ مرمر کا روپ اختیار کر لیا ہے اس کا سبک توازن اگر ہمیں سکون اور آسودگی بخشتا ہے تو اس کا دلربا گنبد اس کے چار مینار اور چبوترے، رفعت اور وسعت، اس کی جالیاں اور نقوش ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چپکے چپکے ہمارے کانوں میں پیار اور محبت کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے پاکیزہ چمن کی کسی قدر شرمائی ہوئی سی خاموش نہر اور اس کے فوارے دروازے سے داخل ہوتے ہی، اگر آپ شام کو تاج محل دیکھنے جائیں تو نیچے سروں میں بیک وقت غم و آرزو انبساط و دل گرفتگی کا شام کلیان سنانے لگتی ہیں، "تاج محل اتنا خوبصورت کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کے بنانے والے وہ معمار تھے جن کے بزرگوں نے صدیوں پہلے سانچی اور اجنتا اور ایلورا بنائے تھے۔ جنھوں نے کونارک اور بھونیشور کے مندروں کی تعمیر کی تھی اور جنھوں نے تیرھویں صدی

کے بعد سے ایران اور ایشیائے کوچک اور وسطی ایشیا کے فن تعمیر سے متاثر ہو کر بہت سے نئے خیالات کو پٹھان اور مغل عہد کے ہندوستان میں سابق ہندستانی فن تعمیر کے ساتھ ملایا تھا تاج محل اتفاقاً اور یک بارگی نہیں بن گیا۔ اس کے گنبد کے نیچے اور اوپر کے حصہ میں اس نیلے کنول کی کھلی ہوئی پتیاں بنی ہوئی ہیں جس پر ہندو اور بدھ مندروں اور منڈپوں میں وشنو اور مہاتما بدھ بیٹھے ہوئے دکھائے جاتے تھے۔ تاج محل کے اندرونی درمیانی حصہ کے اردگرد جو جالی دار کمرے بنے ہوئے ہیں اس کا نقشہ ہندستانی پنچ تنتر یعنی پانچ گوشوں والے قدیم مندروں کے مطابق ہے

..... تاج محل کے باغ اور چمن کے بنانے والے کا نام ایک ہندو کشمیری کا ہے، اسی طرح قنوج کے ہندو کاریگروں کے بھی نام ہیں۔ تاج محل اگر صرف باہر سے آئے مسلمانوں کے فن تعمیر کی نمایندگی کرتا تو یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی عمارت کسی دوسرے خالص مسلم دیس میں جو کاشغر سے لیکر مراقش تک پھیلے ہوئے ہیں کیوں نہیں ملتی ؟ دراصل ہمارے ہندستانی فن تعمیر کا نقطۂ عروج ہے جو صدیوں سے یہاں پرورش پا رہا تھا۔ اس میں اجنتا کی صاف لکیریں ہیں۔ اس میں شیر شاہ کے مقبرے اور بیجاپور کے گنبد، کشمیر کے حسین باغوں، اکبر کی فتحپور سیکری کی تمام خوبیاں کسی قدر ایرانی اثرات کے ساتھ آکر مل گئی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے سنگیت کے اُن راگوں میں جن کی گائیکی امیر خسرو تان سین، سدارنگ اور تان رس خاں اور جون پور کے سلطان حسین شرقی نے خیالی طرز میں مقرر کیں جس کا ایک بلکہ رنگ لکھنؤ میں ٹھمری کے طرز میں ظاہر ہوا اور جو آج بھی عظیم ہندستانی موسیقی کی سب سے دل پسند اور مستند گائیکی ہے۔

اسی زمانہ میں بھگتی اور تصوف اور گورو نانک کی عوامی تحریکیں اُٹھیں جن میں اس ملک کے تمام رہنے والوں کو برابری۔ بھائی چارے، انسانی مساوات اور محبت اور مودت کا سبق دیا گیا ہے۔ شمالی ہند کی جدید زبانوں بنگالی، گجراتی، اُردو، اودھی اور برج بھاشا کی عظیم شاعری اور ادب کا ارتقا بھی اسی زمانہ میں ہوا۔ اگر ہمیں ہندستانی روح اور ہندستانی ذہن کی بلند ترین اور حسین ترین پرواز کو دیکھنا ہے اور یہ سمجھنا ہے کہ ہماری قوم نے کس طرح اس سات آٹھ سو سال میں اپنے کو بنایا اور سنوارا، زندگی اور اس کے مسایل کو کس طرح سمجھا۔ اس میں کون سی خرابیاں تھیں اور ہندستانی دماغ کس طرح اپنے مسایل کو حل کرنے کی کوشش کرتا تھا تو بغیر کبیر داس، گرو نانک، تلسی داس، دارا شاہ، ملک محمد جایسی، عبدالرحیم خانخاں، سورداس، بہاری، میر، سودا، نظیر اکبرآبادی، میر انیس اور غالب کو پڑھے اور سمجھے بغیر نہیں کر سکتے۔

ہم ایک نئے جمہوری، خوش حال، پُرامن اور مہذب بھارت کا نرمان کرنا چاہتے ہیں اور ہماری قوم کی عظیم اکثریت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایسا بھارت سوشلسٹ طرز کے سماج کی بنیاد پر ہی بنایا جا سکتا ہے۔ اس نئے بھارت کی تہذیب کیسی ہوگی ؟

یقینی اس کی بنیاد جدید سائنسی خیالات، جدید سائنسی ٹکنیک پر ہوگی جن کی مدد سے ہم اپنے معاشی مسایل کو حل کریں گے۔

اپنے سماج میں اونچ نیچ کی تمیز کو مٹائیں گے اور اُن محنت کش لوگوں کو حکمراں بنائیں گے جو زندگی کی تمام مادی اقدار کو پیدا کرتے ہیں .....

..... ہم باہر کے دوست اور ترقی یافتہ دیسوں سے اس کام میں مدد بھی لیں گے، لیکن مجھے اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ ہماری نئی تہذیبی زندگی، نئی بھارتیہ سبھیتا کا نیا تاج محل اپنے خمیر میں ویدوں اور اپنشدوں، مہابھارت اور رامائن، کالی داس اور بھاس اور بھرتری ہری، تلسی اور سور، میر اور غالب کی تخلیقوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوگا اس میں تان سین کے امر سنگیت کا رس ہوگا اس میں گپت کال کے بت تراشوں کی طلسماتی اُنگلیوں کی پاکیزہ لکیریں ہوں گی اور سانچی اور ایلورا۔ فتح پور سیکری کے معماروں کا لطیف اور روح پرور ہنر ہوگا اور بلاشبہ ہماری تہذیب کا یہ تاج محل پہلے کی تمام تخلیقوں سے زیادہ تسکین بخش زیادہ حسین اور زیادہ جاندار ہوگا۔

توقیت

تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ توقیت مرتب کی تھی جس میں ۱۵۱ھ سے ۹۳۲ھ تک کے تمام اہم تاریخی واقعات بتقید سنہ ہجری یکجا کر دئے گئے ہیں۔ تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کام آمد چیز ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

اقبال اور غالب

(اثر جلیلی)

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کار لیست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص اپنی شورشِ پسندی کی تسکین کے لئے کسی کی تنقیص کو انتقاد کا کمال سمجھ لے اور دو مختلف العصر شعراء کا تقابلی مطالعہ اس حیثیت سے کرنے کے درپے ہو کہ وہ ایک کو پست اور دوسرے کو بلند ثابت کرنے کی سعیِ بیجا میں صداقت اور ادبی دیانت سے بھی چشم پوشی کرے تو اسے کسی صورت میں بھی انتقاد کا معیاری طریقہ نہیں کہا جا سکتا اور بالخصوص جبکہ اس نوع کی ساری کوشش کا ماحصل کوئی تحقیق یا "افادیت" نہ ہو بلکہ محض برسبیلِ "عناد" یا "تفریح" ایسا کیا جائے۔ اس نوع کی کوششوں میں مصروف ہو کر بعض حضرات نقد و نظر کے بنیادی اصولوں تک کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔۔۔

اس قسم کی ایک تازہ مثال فرمان فتحپوری کا مضمون "اقبال اور غالب" ہے جو دسمبر ۵۵ء کے نگار میں شایع ہوا ہے۔ ہر چند مضمون بذاتِ خود کسی توجہ کا مستحق نہیں لیکن نگار ایسے موقر جریدہ میں اس کی اشاعت نے اسے کسی حد تک توجہ طلب بنا دیا ہے۔ جہاں تک اقبال کی تنقیص کا تعلق ہے فرمان صاحب نے اقبال کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے رہا غالب کی ستائش کا مسئلہ تو اس مضمون کو پڑھ کر اسے بھی تحسینِ ناشناس کہنا پڑتا ہے۔

پسندیدگی اور ناپسندیدگی ہر شخص کا انفرادی فعل ہے اور اس سلسلہ میں ہر فرد کلیتہً آزاد اور حق بجانب ہے کہ وہ اپنے فیصلہ پر قایم رہے۔۔۔ لیکن ایک نقاد کے لئے یہ بے انتہا ضروری ہے کہ وہ اپنی اس قسم کی رائے کے استحکام کے لئے دلایل و براہین کو منطقیانہ تسلسل سے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہاں آکر وہی اظہارِ پسندیدگی و ناپسندیدگی کا فعل انتقاد بن جاتا ہے۔ ایک ہی فعل کہیں رائے ہے اور کہیں انتقاد۔ فرمان صاحب، اقبال کو پسند نہیں کرتے یہ ان کی رائے ہے لیکن جب وہ اس کے اسباب و علل بیان کریں گے تو اس کے لئے نقد و تبصرہ کے تمام قواعد و ضوابط کی بجا آوری ان کا اولین فرض ہو جائے گا اس لئے کہ اس بجا آوری سے کوتاہی ناقد کو سلامت روی سے دور کر دیتی ہے جس کا شکار فرمان صاحب بھی ہوئے ہیں۔

انتقاد کا سائنٹفک ہونا ضروری ہے اور اس کا محض خیال آرائی سے کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ، عمرانیات، نفسیات اور منطق جو سب سائنٹفک علوم ہیں ناقد کے لئے لابدی ہیں اور ان کے صحیح استعمال کے بغیر صحت مند انتقاد کا منصۂ شہود پر آنا ناممکن ہے۔ مندرجۂ بالا علوم اربعہ سے غفلت ناقد کو کبھی صحیح نتائج تک نہیں پہونچنے دے گی۔ اسی طرح دو شاعروں کا موازنہ یا تقابلی مطالعہ جبکہ ان کے ماحول، ان کے ادوار اور ان کے ذرایع حصولِ علم مختلف ہوں بہت مشکل ہے اور ہر کس و ناکس کے اختیار سے باہر ہے۔ فرمان صاحب کا زیرِ بحث مضمون دیکھ کر مجھے یاد آگیا کہ مولانا اسلم جیراجپوری نے اقبال کی مثنوی "اسرار و رموز" پر مضمون لکھتے ہوئے کسی معترض کے جواب میں لکھا تھا کہ ایک بزرگ نے چرکین کے دیوان کی متصوفانہ شرح لکھی تھی اور میرا خیال ہے کہ فرمان صاحب نے بھی اپنی کوشش کو بڑی حد تک اسی قدر مضحکہ خیز بنا لیا ہے۔ یہ صرف قرینِ قیاس اور ممکن ہی نہیں بلکہ عین حقیقت ہے کہ چند خیالات و عقاید میں اقبال اور غالب ایک دوسرے کے مماثل ہیں اور چند اقدار دونوں میں مشترک ہیں لیکن

غالب کے یہاں وہ سب کچھ پاتا جو اقبال کے یہاں ہے قطعی لایعنی ہے۔

اقبال اور غالب میں اہم ترین فرق ان کے نقطہائے نظر کا ہے۔ اقبال کا نقطۂ نظر اجتماعی اور سیاسی ہے اور غالب کا نقطۂ نظر انفرادی اور غیر سیاسی۔ غالب جاگیردارانہ نظام کا پروردہ اور عہدِ انحطاط کا تربیت یافتہ ہے اور اقبال عصرِ بیداری کا آوردہ۔ غالب کے اشعار میں ندرتِ خیال اور بدعتِ اسلوب کی لاتعداد مثالیں مل سکتی ہیں لیکن بیداری کا پیغام نہیں مل سکتا وہ کسی سیاسی انقلاب کا نقیب ہرگز نہیں تھا۔ غالب انفرادیت کا نمایندہ ہے اور اس کے کلام میں فرد کی زبوں حالی اور پستی کی عکاسی ضرور ملتی ہے اس لئے کہ اس کی اپنی زندگی باندازِ چکیدن سرنگونی میں گزری جس کا تعلق اقبال کی شاعری سے ہرگز نہیں۔ غالب کے عقاید و خیالات میں ہم آہنگی نہیں برخلاف اس کے اقبال کے یہاں زندگی کا ایک واضح تصور ملتا ہے اور اس کا نقطۂ نظر سائنٹفک ہے۔ اقبال کا مطالعہ دوسرے شعراء کے مطالعہ سے مختلف طریقِ کار چاہتا ہے۔ غالب کو سمجھنے کے لئے اس کے شخصی حالات یا زیادہ سے زیادہ ہندوستان کی صدسالہ تاریخ کافی ہے، لیکن اقبال کو سمجھنے کے لئے ایک قوم کی تاریخ درکار ہے جو تیرہ صدیوں پر محیط ہے اور عرب کے ریگزاروں سے لیکر تقریباً دو تہائی کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہے۔

ہمارے اکثر ناقد جو اقبال کو پسند نہیں کرتے یا تو بنیادی طور پر اس کے نقطۂ نظر کے مخالف ہیں یا پھر ایک طبقہ وہ ہے جو اسے سمجھے بغیر مخالفت پر آمادہ ہوگیا ہے۔ موخرالذکر طبقہ نے اقبال کے مطالعہ کا کوئی منضبط طریقہ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے شعراء کی طرح اس کے کلام کا جستہ جستہ مطالعہ کرکے رائے قایم کرلی ہے۔ اسی طبقہ کی ایک شاخ یہ ہے جو اقبال کو صرف نقال منوانے کے درپے ہے۔ ہمارے اکثر نوجوان اور بعض بزرگ بھی اس خبط میں مبتلا ہیں کہ وہ اقبال کے ماخذ برگساں، نطشے، کانٹ اور کارل مارکس یا دوسرے مشرقی اور اسلامی حکماء وغیرہم کو ثابت کریں حالانکہ واقعہ نفس الامری یہ ہے کہ بعض مقامات پر مغربی اکابرین فلسفہ خود ان اصولوں سے قریب تر ہوگئے ہیں جہاں سے اقبال بھی استفادہ کرتا ہے لیکن ہم اس التباس ذہنی میں مبتلا ہوگئے کہ یہ مشابہت اقبال اور ان متقدمین میں ہے حالانکہ دراصل یہ مشابہت ان متقدمین اور اسلام کے بعض عالمگیر اصولوں میں ہے۔

ہمیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ یہ عالم عالمِ اسباب ہے اور یہاں کا کاروبار فرقِ عادات یا معجزات کا مرہون نہیں بلکہ تواترِ علل کا رہینِ منت ہے۔ یہاں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے اور جلتا رہے گا۔ اس نوع کا استفادہ نسل انسانی کا ایسا ورثہ ہے جس سے کسی کو محروم نہیں کیا جا سکتا اور نہ کیا جا سکے گا۔ ذہنی توارث کا یہ عمل ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا ورنہ تہذیب و تمدن کی ساری عمارت ڈھیر ہوجائے گی۔ ماضی سے قطع ہوکر حال اور مستقبل دونوں مہمل ہیں بغیر "دوش" کے "امروز و فردا" کا تصور بھی دشوار ہوجاتا ہے۔ ندرت پسندی اور جدت طرازی کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ بیک صدائے "کن" کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے برخلاف اس کے یہاں قطرے سے گہر ہونے تک صدہا منزلیں ہیں۔ یونان میں علم و حکمت کی جو شمعیں روشن ہوئی تھیں ان سے آج بھی اکتسابِ نور ہو رہا ہے۔ جنھیں قدرت کی فیاضی بداعت و اختراع کی قوت ودیعت کرتی ہے وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ :-

مشاطہ را بگو کہ برا سبابِ حسنِ یار — چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد

ارتقائے خیال اور افزایشِ اسبابِ حسن کی مثالوں سے تاریخِ ادب کے اوراق بھرے پڑے ہیں مثلاً سعدی کا شعر ہے کہ :-

از ورطۂ ما خبر نہ دارد — آسودہ کہ بر کنارِ دریاست

حافظ نے اس پر اضافہ کرکے یوں کردیا کہ :-

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حایل — کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحلہا،

اور غالب نے یوں بدل دیا کہ :-

ہوا مخالف و شب تار و بحرِ طوفاں خیز — گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

ظاہر ہے کہ یہ نہ سرقہ ہے نہ توارد بلکہ استفادہ ہے اور نہ حافظ کے لئے شرمناک ہے نہ غالب کے لئے اور نہ اس سے ان دونوں

کی شاعرانہ عظمت پہ حرف آتا ہے، بقول ایک انگریزی نقاد کے کہ :۔

"ٹینی سن کے کلام میں چاسر اور کولرج جیسی شگفتگی اور اپج، اسپنسر کی خوبیِ ترتیب اور وسعتِ نظر، شکسپیر کی ہمہ گیری اور رفعت و عمق، ملٹن کی شان و شوکت اور سنجیدگی، ورڈزورتھ کی فطرت پرستی وغیرہ مجموعی حیثیت سے پائی جاتی ہے" روحِ تنقید صفحہ ۲۵

گویا ٹینی سن کا اپنا کچھ نہیں ہے مگر بقول ڈاکٹر زور ظاہر ہے کہ اس سے ٹینی سن کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اخذ و استفادہ یا مماثلت کی چند واضح مثالیں غالب کے کلام سے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں :۔

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
غالب

شد روشنم از شمع کہ در بزمِ حریفاں
خاموش شدن مرگ بود اہلِ زباں را
غنی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
غالب

رازِ دیرینہ زرخ پردہ برانداخت دریغ
حالِ ما شہرہ بانشائے غزل ساخت دریغ
نظیری

نہ بدرجستہ شرارد نہ بجا ماندہ رماد،
سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت
غالب

لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھیو راکھ
میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ
معلوم

مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی باک نہیں کہ میرا مقصد وہ نہیں جو فرآن صاحب کا ہے بلکہ غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے کہ ایسا کون ہے جو استفادہ نہیں کرتا اور نہ اس قسم کی جزوی مماثلت اور اشتراک عیب ہے۔ اس بحث کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ غالب جو اس کا مدعی تھا کہ اگر سخن آئینِ دہر ہوتا تو اس کا دیوان اس دین کی کتاب ہوتا اس قسم کے توارد سے محفوظ نہیں تو پھر اقبال ہی کے لئے یہ عیب کیوں ہے جبکہ وہ تو شاعری کا دعویٰ بھی نہیں کرتا اور ببانگ دہل کہتا ہے کہ :۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

نہ زباں کوئی غزل کی نہ غزل سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

اس روشنی میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کے درپے ہونا ایک مہمل سی بات ہے کیونکہ وہ تو خود ہی اس کا مدعی نہیں ہے اور بات ہے کہ اس کے باوجود اقبال کے یہاں اس کی شاعرانہ اور فنکارانہ عظمت کی بھی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔

برخلاف اس کے کوائفِ نفسیہ جو نوعِ بشر میں مشترک ہیں ان کے اظہار میں مماثلت دیکھنا کچھ مضحکہ خیز سی چیز ہے اس لئے کہ بعض اوقات تو اس سلسلہ میں بعد المشرقین بھی قدے فاصلہ وارد سے زیادہ وقیع نہیں ہوتا کیونکہ

ہر کوئی دامانگیِ میں نالہ سے ناچار ہے

اس سلسلہ کی ایک واضح مثال اوپر پیش کر چکا ہوں۔ گو یہ کہنا دشوار ہے کہ غالب نے اپنے فارسی شعر میں دوہے سے استفادہ کیا ہے لیکن اس کے باوجود معنوی یکسانیت مجبور کرتی ہے کہ ایسا مان لیا جائے اب یہ اور بات ہے کہ تحقیق کی کسوٹی پر یہ دعویٰ پورا نہ اترے۔

ہمارے نوجوان نقاد اکثر صداقت اور اصول کو کسی عارضی مقصد پر قربان کر دیتے ہیں جو کم از کم میری نظر میں ادبی اور ناقدانہ دیانتداری

کے منافی ہے ہر چند میرا مقصد کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں لیکن محض خلوص نیت کی بنا پر زہر تریاق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فرمان صاحب سے بھی یہ کیک لغزش ہوئی ہے اور اکثر انھوں نے غالب کے اشعار کو ایسے ایسے بعید الفہم مطالب دئے ہیں کہ "بسوخت عقل زحیرت" کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"اقبال کہتے ہیں کہ فطرت کی گلکاریاں انسان کی شوخیِ افکار کے بغیر بے روح و بے جان ہیں لالہ کا دل ہزار داغ دار سہی لیکن وہ انسان کے دل کی طرح آرزو کا گھایل نہیں، نرگس میں لاکھ بصارت سہی لیکن اس میں وہ بصیرت کہاں جو لذتِ دیدارِ یار سے سرفراز ہوتی ہے چنانچہ زبورِ عجم میں کہتے ہیں:۔

لالۂ ایں گلستاں داغِ تمنائے نہ داشت　　نرگسِ غمازِ او چشمِ تماشائے نہ داشت

غالب بھی فطرت کے ہر نقش کو گوشت پوست کے انسان کے مقابلہ میں ہیچ بتاتے ہیں کہ انسان میں جمیع حسن و لطافت مرکوز ہیں گل و نرگس کی رونق و زینت صرف انسانی توجہ کی پابند ہے۔

گلت را نوا نرگست را تماشا،　　تو داری بہارے کہ عالم ندارد"

مجھے افسوس ہے کہ فرمان صاحب نے صرف گل، نرگس تماشا کے لفظی اشتراک کی بنا پر جو معنوی مماثلت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ نقش برآب سے زیادہ نہیں درحقیقت نہ دونوں شعروں میں کوئی معنوی مماثلت پائی جاتی ہے نہ فرمان صاحب کے فرمودہ مطالب اور شعر میں مطابقت ہے۔ غالب کے شعر کا حسن اور اقبال کے شعر کی معنویت دونوں ناقد کے زورِ قلم کے نذر ہو گئے غالب کے شعر کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ شاعر نے پہلے تو محبوب کے لبوں کو گل اور آنکھوں کو نرگس فرض کر لیا اور پھر گل و نرگس کے لئے نوا اور تماشا کو لازم کر کے کہتا ہے کہ ایسی بہار تو سارے عالم میں نہیں جیسی تیرے پاس ہے کیونکہ دنیا کی کسی بہار کے لئے ممکن نہیں کہ اس کے گل کو نوا اور نرگس کو تماشا نصیب ہو سکے۔ اقبال کے شعر کو ان معنی سے کوئی تعلق نہیں وہ صرف اپنے عہد اور اپنے قوم و وطن کی بے بصری کا ماتم کر رہا ہے اور بس نہ جانے فرمان صاحب کے فرمودہ مطالب انھیں کیسے حاصل ہوئے رہے بڑا فرق جو دونوں شعروں میں ہے وہ اقبال اور غالب کے ذہنی پس منظر کو ملحوظ رکھنے سے اجاگر ہو جاتا ہے۔ اس ہٹ دھرمی پر ایک لطیفہ یاد آگیا جب جوش ملیح آبادی کا مجموعہ "آیات و نغمات" شایع ہوا تو اس پر معاندانہ اظہار خیال کرتے ہوئے یاس یگانہ چنگیزی نے شاید "نیرنگِ خیال" میں لکھا تھا کہ یہ ہیں وہ شاعر انقلاب جنھیں اپنے مجموعہ کے لئے نام نہیں ملتا اور انھوں نے میرے مجموعہ کلام "آیاتِ وجدانی" سے لفظ "آیات" لے لیا۔ گویا آیات تو یگانہ کو الاٹ ہو چکا تھا دوسرا کیونکر استعمال کر سکتا ہے۔ ایسی ہی بات فرمان صاحب نے کہدی ہے:۔

یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

مندرجۂ بالا قسم کی مثالوں کے ساتھ ساتھ فرمان صاحب نے اس مضمون میں عجیب متضاد اور متباین خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے پیشِ نظر ان کے مافی الضمیر کا متعین کرنا کم از کم میرے لئے تو دشوار ہے اور پورا مضمون پڑھکر بھی یہ نہیں کھلتا کہ ناقد کا مطمحِ نظر کیا ہے اور تنقیص و تحسین کا کیا معیار قایم کرنا چاہا ہے اس کی ادنیٰ سی مثال مندرجۂ ذیل اقتباسات ہیں:۔

(ا) "غالب شاعری میں فلسفہ کی صرف ایک صفت یعنی موضوع کی کلیت و ہمہ گیری کو ملحوظ رکھتے تھے ان کے یہاں انسان کے عام فطری تقاضوں، خواہشوں، ولولوں، مایوسیوں اور تجربوں کی عکاسی ہے، زندگی کے مختلف حقیقی اور دائمی پہلوؤں کی تشریح ہے، انسانی محسوسات کے نفسیاتی تجزئے ہیں ۔۔۔۔۔ غالب کے یہاں فلسفہ ہمیشہ فن سے مغلوب رہتا ہے"

(ب) "اقبال کے یہاں ایک متعین و مخصوص فلسفۂ حیات ملتا ہے جو عقلی اور لچکدار ہونے کے باوجود بڑی حد تک نظری اور جامد ہے اقبال اقتضائے بشری اور انسانی نفسیات کو اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں اور ایسا یزداں شکار و کمند آور رجائیت کا سبق دیتے ہیں جو زندگی کے عملی میدان میں اس قدر کار آمد نہیں جس قدر وہ نظری طور پر معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے یہاں اکثر فلسفہ فن پر غالب آجاتا ہے"

(ج) "غالب اور اقبال کے ان چند مماثل پہلوؤں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں میں بڑی حد تک فکری یگانگت و تخیلی مناسبت ہے۔"

(د) "غالب اور اقبال دونوں بالکل متضاد ماحول کے ترجمان ہیں"

(ہ) "اقبال کے خیالات و افکار اگر غالب سے ماخوذ نہیں تو ان کے معنوی فیض سے یکسر خالی بھی نہیں"۔

(و) "جس طرح اقبال نے دوسرے حکماء اور علماء سے استفادہ کیا ہے وہاں خود اُردو کے ایک شاعر سے بہت کچھ لیا ہے"

(ز) "اُردو شاعری میں اقبال کے یہاں غالب کی روح کا کہیں پتہ نہیں چلتا"

(ح) "یہ کہنا کہ اقبال کی شاعری میں غالب کی روح کام کر رہی ہے یا یہ کہ اقبال کی صورت میں غالب نے دوبارہ جنم لیا ہے کسی طرح درست نہیں"۔

(ط) "ایک گونہ اشتراک کے باوجود ہم انھیں ایک دوسرے کی بازگشت نہیں کہہ سکتے"۔

اگر اقتباسات کی بہتات کا اندیشہ دامنگیر نہ ہو تو ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میری رائے میں تو یہ مضمون صرف لکھنے کے لئے لکھا گیا تھا اور بس اس لئے کہ اتحاد فکر اور مرکزیت یکسر مفقود ہے مثلاً مضمون نگار نے اقتباس (ا) میں جن خصائص کو غالب سے زیادہ داغ کا طرۂ امتیاز ہیں اور جہاں غالب نے انھیں اختیار کیا ہے وہاں غالب، غالب نہیں رہتا مثلاً :-

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن
پنبس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا تیرے پیچھے — یہ دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

غالب ساری عمر "رسم و رہِ عام" سے بچ کر چلتا رہا اور آج ہمارے فاضل نقاد کو یہی "رسم و رہِ عام" غالب کی خوبی نظر آ رہی ہے اسی طرح اقتباسات (ا) اور (ب) میں اقبال اور غالب کا فرق جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہیں یعنی غالب کے مقابلہ میں اقبال کی پستی کا سبب یہ ہے کہ "اقبال کے یہاں ایک متعین اور مخصوص فلسفۂ حیات ملتا ہے"۔ دراصل ہمارے نوجوان اقبال کے فلسفۂ سخت کوشی سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکتے، اس لئے وہ اس کی رجائیت کو نظری اور جامد کہنے لگتے ہیں محض اس لئے کہ اس کے نظریات ان کی تن آسانی اور سہل انگاری سے متصادم ہوتے ہیں اور ان کے ذہنی تعیش کا نگار خانہ منہدم ہو جاتا ہے۔ اقبال کا یہ کہنا کہ "یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ" ان کی خواہش کہ "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے" کے منافی ہے! اقبال کا یہ کہنا کہ

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

غیر فطری تقاضا ہے اور انسانی نفسیات کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے برخلاف اس کے غالب کا یہ کہنا ہے کہ :-

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

زندگی کے حقیقی اور دائمی پہلوؤں کی تشریح ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اقتباسات (ج) تا (ط) فکری یگانگت کے برخلاف متضاد دعاوی کی نمایندگی کر رہے ہیں۔

میں سطور بالا میں کہیں عرض کر چکا ہوں کہ غالب عہد انحطاط کا تربیت یافتہ ہے اور اقبال عصر بیداری کا آوردہ اور آپ دیکھیں گے کہ یہ بنیادی فرق دونوں کے کلام میں قدم قدم پر ملے گا۔ ہمارے ادب کے لئے یقیناً دونوں مایۂ ناز ہیں لیکن دونوں کی حیثیتیں مختلف ہیں ہر چند ہمارے لئے دونوں قابلِ احترام ہیں لیکن دونوں کے مدارج جدا ہیں، اور ایک نقاد کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ ان چیزوں کو نظر انداز کر دے اور ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کی عینک لگا کر جادہ بیجا کا امتیاز ہی مٹا دے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

خیام کی رُباعیاں

(عابد رضا بیدار)

فٹز جیرالڈ کے ترجمہ سے یورپ میں خیام کی مقبولیت کی ابتدا ہوتی ہے ترجمہ کا پہلا اڈیشن ۱۸۵۹ء میں نکلا۔ فٹز جیرالڈ نے بوڈلین کے قلمی نسخہ کو اپنی اساس بنایا تھا جو ۱۴۶۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ ترجمہ بالکل آزاد قسم کا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں روسی مستشرق ژوکوفسکی کا مقالہ "خیام کی آوارہ گرد رباعیاں" کے عنوان سے شایع ہوا اس نے بتایا کہ نکولس کے پیرس ایڈیشن میں جو ۱۸۶۷ء میں شایع ہوا تھا اور جس میں ۴۶۴ رباعیاں تھیں ان میں ۸۲ رباعیاں ۳۹ مختلف شاعروں سے منسوب پائی گئیں۔ اس کے بعد سر ڈینی سن راس اور کرسٹنزن کی تحقیق کی رو سے ان 'آوارہ گرد' رباعیوں کی تعداد بڑھکر ۱۰۸ تک جا پہونچی۔

۱۹۰۴ء میں کرسٹنزن نے صرف ۱۲ رباعیوں کو صحیح طور پر خیام کی ملکیت تسلیم کیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں اس کی تحقیق کے مطابق یہ تعداد ۱۲۱ ہوگئی۔ ۱۲۱ کی یہ تعداد اس نے ان ۱۲۳۱ رباعیوں میں سے چھان بین کرکے نکالی تھی جو مختلف جگھوں پر خیام کی طرف منسوب پائی گئی تھیں کرسٹنزن نے تو بہت گنجایش نکالی لیکن نکلسن کے خیال میں موجودہ رباعیوں میں کسی ایک کا انتساب بھی خیام کی طرف غلط ہے۔ اور شیدر نے ۱۹۳۴ء میں اس جھگڑے ہی کو ختم کردیا تھا اس کا خیال تھا کہ خیام نے حقیقت میں کچھ لکھا ہی نہیں ہے اور یہ کہ خیام کا نام تاریخ ادب فارسی سے نکال دینا چاہیئے۔ براؤن رباعی گو خیام کا قایل تھا مگر کسی ایسی رباعی کے وجود کا قایل نہ تھا جس میں 'آمیزش' نہ ہوئی ہو۔

یہ سب محققین جنھیں اُن رباعیوں پر شبہ تھا استدلال اس بات سے کرتے تھے کہ خیام کی رباعیوں کے جتنے نسخے اب تک ملے ہیں ان میں جو جتنا قدیم ہے اس میں اتنی ہی کم رباعیاں ہیں۔ بوڈلین کے نسخہ میں ۱۵۸ رباعیاں ہیں۔ یہ نسخہ خیام کے انتقال کے ۳۸۸ سال، یا ڈاکٹر مینوی کی تحقیق کی رو سے ۳۳۸ سال بعد لکھا گیا ہے۔ استنبول میں کئی نسخے ملے۔ ایک جو بوڈلین کی تاریخ کا ہے اس میں ۳۱۵ رباعیاں ملیں لیکن ایک اور جو اس سے چار سال پہلے کا ہے اس میں صرف ۱۳۱ رباعیاں تھیں۔ دیکھا یہ گیا کہ سولھویں صدی اور اس کے بعد کے نسخوں میں یہ تعداد تیزی سے بڑھتی گئی ہے۔

۱۹۲۵ء تک نسخۂ بوڈلین سے قدیم تر کوئی نسخہ نہیں ملا اسی سال جرمن اسکالر روزن نے ۱۳۲۱ء کا ایک نسخہ ڈھونڈھ نکالا جس میں ۳۲۹ رباعیاں تھیں مگر بہت جلد اس نسخہ کی قدامت شبہ میں پڑگئی اور بعد میں ثابت ہوگیا کہ اس کی کتابت سولھویں بلکہ سترھویں صدی عیسوی کی ہے۔

خود خیام کے ہموطن جو کچھ کام کر رہے تھے ان میں قزوینی اور محمد علی فروغی قابلِ ذکر ہیں۔ قزوینی نے ایک بیاض میں جو ۱۳۴۰ء کی لکھی ہوئی تھی خیام کی ۱۳ رباعیاں پائیں۔ اسی قسم کا ایک مجموعہ رمپس کے ہاتھ بھی لگا تھا اور وہ اس سے دس سال پہلے کا لکھا ہوا تھا اس میں ۳۳ رباعیاں تھیں۔ محمد علی فروغی نے ڈاکٹر قاسم کے ساتھ مل کر ۱۹۴۲ء میں ۱۷۸ رباعیاں تلاش کرکے صحت کے ساتھ قایم کیں۔

فروغی ایڈیشن، خیام کے سلسلہ میں مشرق کا پہلا کارنامہ تھا اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے کام کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوسرا۔ ہمعصر یا قدیم نسخوں کا کہیں وجود نہ تھا آوارہ گرد رباعیوں کی تعداد متعین ہی نہیں ہو پائی تھی، آخر کیا معیار اختیار کیا جائے جس کی رو سے کسی رباعی کو یقینی طور سے خیام سے منسوب کیا جاسکے۔ فروغی نے اس کے لئے بڑی صحیح راہ اختیار کی اور وہ یہ کہ بعض ایسی رباعیوں کے مطالعہ سے

یقیناً خیام کے علاوہ کسی کی نہیں ہیں خیام کے رنگ کا پتہ چلایا جائے اور اس کے بعد دوسری رباعیوں میں جو خیام سے منسوب ہیں لیکن مشکوک ہیں اس 'رنگ' کو تلاش کیا جائے جو رباعی اس کسوٹی میں پوری اُترے اور بظاہر کسی دوسرے شاعر کی طرف منسوب کرنے کے لئے کوئی معقول وجہ بھی نہ ہو، تو اسے خیام کی ملکیت مان لیا جائے۔

خوش قسمتی سے ایک قابلِ لحاظ تعداد میں خیام کی وہ رباعیاں مل گئیں جو یقینی طور سے اسی کی ملکیت تھیں جن پر کسی قسم کا شک یا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا یہ رباعیاں تعداد میں ۶۲ تھیں۔ اتنی بڑی تعداد کے مطالعہ کے بعد خیام کے اسلوب اس کی فکر اور اس کے رنگ کا آسانی سے اندازہ ہو سکتا تھا یہ ۶۲ رباعیاں کہاں کہاں سے ملیں اس کی تفصیل آگے آئے گی (یہ تعداد سلیمان ندوی مرحوم کی دی ہوئی تعداد کے ساتھ مل کر ۷۲ ہو جاتی ہے)

یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر کوئی مطمئن نہ تھا۔ خیام کے بارے میں مشرق و مغرب میں اتنا کچھ لکھا جا چکا تھا کہ کسی بھی بڑے مصنف کی طرح خیام پر اچھی خاصی لائبریری بنائی جا سکتی تھی الجھن ابھی تک باقی تھی وہ خیام جس کی اب تک کئی کئی سو رباعیاں پڑھی جاتی تھیں اس کے پرستار آخر ۷۲ پر کیسے قانع ہو سکتے تھے۔

بالآخر پروفیسر آربری کا کام اس سلسلہ میں حرفِ آخر بن کے رہا۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے ۱۷۲ رباعیاں شایع کیں یہ ۶۵۸ھ/۱۲۵۹ء کا نسخہ تھا جس کا کاتب کوئی محمد القوام نیشاپوری تھا ان ۱۷۲ رباعیوں میں ۸ بالکل نئی تھیں۔ اس کے فوراً بعد ایران کے ادبی ماہنامہ "یادگار" میں غالباً پروفیسر عباس اقبال کا ایک مضمون نکلا جس میں انھوں نے ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء کے ایک نسخہ کا تعارف کرایا اور کچھ رباعیاں نمونتہً نقل بھی کیں۔ یہ نسخہ کسی کی پرائیوٹ ملکیت تھا۔ ۱۹۵۰ء ہی میں کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری نے اسے خرید لیا اور ۱۹۵۲ء میں آربری نے اس کا ترجمہ شایع کیا۔ افسوس ہے اس میں اصل متن شامل نہیں ورنہ خیام کے اسکالر اس سے کافی مستفید ہو سکتے۔ حقیقت میں اس نسخہ کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ خیام کے انتقال کے تقریباً ۵۰ سال بعد لکھا گیا ہے جو کسی نہ کسی طرح تاتاری رستخیز سے بچ گیا۔ کاتب کی صراحت کے مطابق یہ رباعیات کا مکمل مجموعہ نہیں بلکہ انتخاب ہے اس انتخاب میں ۲۵۲ رباعیاں ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کل تعداد کم از کم ۵۰۰ تو ہو ہی گی۔ یہی ایک خیال ہے جو دوسری آوارہ گرد رباعیوں کو ایک بار پھر مزید تحقیق و جستجو کا موضوع بنا دیتا ہے۔

تاہم یہ ۲۵۲ رباعیاں بھی ابھی ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ ان کے ترجمہ سے مقابلہ کا کام تو نہیں لیا جا سکتا۔ اس لئے ابھی تک مشرق والوں کے پاس اصل یقینی رباعیاں وہی ۷۲ ہیں جن کو بنیاد بنا کر فروغی نے ۱۷۸ رباعیوں کا مجموعہ شایع کیا۔ ان ۱۷۸ رباعیوں میں تو خود فروغی اور قاسم غنی کا ذوق شامل ہے اس لئے ان کے متعلق ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے اور کیمبرج ایڈیشن کے متن کی اشاعت سے قبل ان ۷۲ رباعیوں کو خیام کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ وہ رباعیاں اور ان کے ماخذ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

رباعیاں پیش کرنے سے پہلے پروفیسر آربری نے اپنے ترجمہ پر جو تعارف لکھا ہے اس میں دو بڑے مفید چارٹ دئے ہیں وہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں:-

مشترک رباعیاں (۱)

۱۳۳۰ء کا نسخہ :	۳۱ رباعیاں	ان رباعیوں میں سے ۱۱ نسخۂ کیمبرج میں ہیں ۱۹۵۰ء کے اڈیشن میں صرف ۹ ہیں
نسخۂ بوڈلین :	۱۵۸ رباعیاں	ان میں سے ۶۰ نسخۂ کیمبرج میں ہیں اور صرف ۴۲ پہلے نسخہ میں۔
نسخۂ کرسٹنسن :	۱۲۱ رباعیاں	نسخۂ کیمبرج میں ۶۷ اور ۱۹۵۰ء کے ایڈیشن میں ۴۸ ہیں
فروغی ایڈیشن :	۱۷۸ رباعیاں	نسخۂ کیمبرج میں ۸۹ اور ۱۹۵۰ء کے نسخہ میں ۶۹

مشترک رُباعیاں (۲)

"سندنامہ" محمد سمرقندی تالیف ۵۵۶ھ	۵ رُباعیاں	۳ رباعیاں کیمرج اور ۱۹۵۰ء کے نسخوں میں
"مرصاد العباد" رازی	۲ رباعیاں	۲ کیمرج میں ایک ۱۹۵۰ء ایڈیشن میں
"تاریخ گزیدہ" مستوفی	۱ رباعیاں	یہ رُباعی دونوں میں نہیں
سعید نفیسی کی دریافت کردہ 'بیاض'	۱۱ رباعیاں	۶ کیمرج نسخہ میں ۴ پہلے والے میں
قاسم غنی کی دریافت کردہ 'بیاض'	۵ رباعیاں	۲ رباعیاں دونوں نسخوں میں ہیں

۱

اے[1] دل حذر ز مستی و مخموری کن — وز ہمدمیٔ رطل گراں دوری کن
از بادہ شفا خیزد و از مستی شوق — توبہ ز شفا کمن ز مخموری کن

۲

یک[2] شیشۂ مے کہن ز ملکے نوبہ — وز ہرج (چہ) نہ مے طریق بیروں شوبہ
چرخشت بہ از ملکِ فریدوں صد بار — خشتِ سرِ خم ز تاج کیخسرو بہ

۳ ۴

گویند[3] بحشر جستجو خواہد بود — وآں یار عزیز تندخو خواہد بود
از خیرِ محض جز نکوئی نآید ،، — خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود
از واقعۂ ترا خبر خواہم کرد — وآنرا بدو حرف مختصر خواہم کرد
با عشقِ تو در خاک فرو خواہم شد — با مہر تو سر ز خاک برخواہم کرد

۵

در[4] دایرۂ کاہدن و رفتن ماست — آخر نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس مے نزند دمے دریں معنی راست — کایں آمدن از کجا و رفتن بکجاست
دارندہ چو ترکیبِ طبایع آراست — از بہرچہ اوفگندش اندر کم و کاست
گر نیک آمد شکستن از بہرچہ بود — ور نیک نیامد ایں صور عیب کراست

---

[1] امیر عنصر المعالی کیکاؤس نے "قابوس نامہ" میں جو ۴۷۵ھ کی تصنیف ہے۔ سلیمان ندوی مرحوم کے بقول، شرابخوری کے آداب کے ذیل میں عمر خیام کے نام سے یہ رباعی نقل کی ہے۔ افسوس قابوس نامہ میں باوجود تلاش بسیار ہمیں یہ رباعی کہیں نہ مل سکی۔ یہ رباعی اور کسی نسخہ میں نہیں پائی جاتی۔

[2] ابوبکر راوندی کی "راحت الصدور" میں جو ۵۹۹ھ۔ ۶۰۰ھ کی تالیف ہے یہ رباعی بلا مصنف کے نام۔ کے درج ہے لیکن یہی رباعی خیام کے اکثر قلمی مجموعوں میں ملتی ہے اس لئے یہ گمان غلط نہیں کہ یہ خیام ہی کی ہے۔ بعض نسخوں میں تیسرے مصرع میں پہلا لفظ "جامیست" ہے اور بعض جگہ "درست"۔ (سلیمان ندوی)

[3] یہ دونوں رباعیاں شمس الدین شہرزوری کی "نزہت الارواح" کے فارسی نسخہ میں خیام کے نام سے درج ہیں کتاب مذکور ۵۸۶ھ یا ۶۱۷ھ کی تصنیف ہے ـــــ سلیمان ندوی

[4] شیخ نجم الدین رازی معروف بہ دایہ نے اپنی کتاب "مرصاد العباد" میں فلسفیوں کی گمراہی اور لاادریت کے سلسلہ میں خیام کے نام سے دو رباعیاں لکھی ہیں۔ "مرصاد" ۶۲۰ھ کی تصنیف ہے یعنی خیام کی وفات کے سو سال کے اندر اندر پھر رازی جیسا ثقہ راوی ۔ فروغی

اجزائے[1] پیالہ کہ درہم پیوست، ✕ بشکستنِ آں روا نمیدارد مست
چندیں سر و پائے نازنیں از سر دست برمہر کہ پیوست و بنام کہ شکست

✕

ہر ذرّہ[2] کہ بر روئے زمینے بودہ است خورشید رخے زہرہ جبینے بودہ است
گرد از رخِ نازنیں بآزرم فشاں کاں ہم رخ و زلفِ نازنینے بودہ است

✕ ۹/۱۴

تا راہ[3] قلندری بنیونی نشود رخسارہ بخونِ دل نشونی نشود
سودا چہ پزی تا کہ چو دلسوختگاں آزاد بترک خود نگونی نشود

یک روز ز بندِ عالم آزاد نیم، یکدم زدن از وجود خود شاد نیم
شاگردیٔ روزگار کردم بسیار در کارِ جہاں ہنوز استاد نیم

ہرگز دلِ من ز علم محروم نشد کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نشد
ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

دشمن بغلط گفت کہ من فلسفیم ایزد داند کہ آنچہ او گفت نیم،
لیکن چو دریں غم آشیاں آمدہ ام آخر کم از آنکہ من بدانم کہ کیم

مائیم کہ اصلِ شادی و کان غمیم سرمایۂ دادیم و نہاد ستمیم
پستیم و بلندیم ..... و کمیم آئینۂ زنگ خوردہ و جامِ جمیم

ترکیبِ طبائع چو بکامِ تو دمے است رو شاد بزی اگرچہ بر تو ستمے است
با اہلِ خرد باش کہ اصل تن تو ۱۵/۲۲ گردے و نسیمے و شرارے و دمے است

خوش باش کہ پختہ اند سودائے تو دے فارغ شدہ اند از تمنائے تو دے
قصہ چکنم کہ بے تقاضائے تو دے دادند قرار کار فردائے تو دے

از دی کہ گزشت ہیچ از و یاد مکن فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گزشتہ بنیاد مکن، حالے خوشِ باش و عمر برباد مکن

پیش از من و تو لیل و نہارے بودہ است در ہر قرنے بزرگوارے بودہ است
ہر جا کہ قدم نہی تو بر روئے زمیں آں مردِ یک چشم نگارے بودہ است

---

[1] یہ رباعی "تاریخ جہانگشائے جوینی" میں جو ۶۵۸ھ یعنی وفاتِ خیام کے ۱۴۰ سال کے اندر لکھی گئی ہے خیام کے نام سے درج ہے — فروغی

[2] حمداللہ مستوفی: "تاریخ گزیدہ" تالیف ۷۳۰ھ — فروغی

[3] نویں رباعی سے ۳۹ ویں رباعی تک کی ۳۱ رباعیاں جرمن مستشرق پرمیسس کی دریافت کردہ "نزہت المجالس" سے ماخوذ ہیں۔ کتاب مذکور استنبول کے کسی کتاب خانہ میں مستشرق موصوف کو ملی یہ ۴۰۰ کے قریب رباعیات کا مجموعہ ہے جس میں مختلف شعرا کی رباعیاں ہیں۔ سال کتابت ۷۲۱ھ ہے اس میں کئی باب ہیں ایک باب کا عنوان ہے "در معانیٔ حکیم عمر خیام" اور اس کے ذیل میں یہ رباعیاں درج ہیں ان رباعیوں میں سے بعض کا دوسری جگہ پتہ نہیں چلتا۔

ہر ذرہ[1] کہ در خاک زمینے بودہ است — پیش از من و تو تاج و نگینے بودہ است
گرد از رخ نازنیں بآزرم فشاں — کآنہم رخِ خوب نازنینے بودہ است

ہر راز کہ اندر دلِ دانا باشد — باید کہ نہفتہ تر ز عنقا باشد
کاندر صدف از نہفتگی گردد دُر — آں قطرہ کہ رازِ دل دریا باشد

ہم دانۂ امید بخرمن ماند — ہم باغ و سرائے بے تو و من ماند
سیم و زرِ خویش از درمے تا بجوئے — با دوست بخور گرنہ بدشمن ماند،

بر شاخِ امید اگر برے یافتمے، — ہم رشتۂ خویش را سرے یافتمے
تا چند ز تنگنائے زندانِ وجود — ایکاش سوئے عدم درے یافتمے

یک[2] جرعۂ مے کہن ز ملکے نو بہ — وز ہر چہ نہ مے طریق بیروں شو بہ
در دست بہ از تختِ فریدوں صد بار — خشت سرِ خم ز تاج کیخسرو بہ

در دہر چو آواز گل تازہ دہند — فرمائے بتا کہ مے باندازہ دہند
از حور و قصور و ز بہشت و دوزخ — فارغ بنشیں کہ آں ہر آوازہ دہند

گیرم کہ بسدرۂ منتہا نرسی — در شیوہ عاقلاں ہمانا نرسی
از سبزہ و مے خیز بہشتے برساز — کآنجا ببہشت رسی یا نرسی

۲۳
۴۲

من مے کہ ز یہر تنگ دستی نخورم — یا از غمِ رسوائی و مستی نخورم
من مے ز برائے خوشدلی میخوردم — اکنوں کہ تو بر دلم نشستی نخورم

گر کارِ فلک بعدل سنجیدہ بُدی — احوالِ فلک جملہ پسندیدہ بُدی
در عدل بُدی بکارہا در گردوں — کے خاطرِ اہلِ فضل رنجیدہ بُدی

ہر یک چندے یکے بر آید کہ منم — با نعمت و با سیم و زر آید کہ منم
چوں کارکِ او نظام گیرد روزے — ناگہ اجل از کمیں در آید کہ منم

عمرے است مرا تیرہ و کارے است شراست — محنت ہمہ افزودہ و راحت کم و کاست
شکر ایزد را کہ آنچہ اسباب بلاست — ما را ز کسے دگر نمیباید خواست

ترکیبِ[3] پیالۂ کہ در ہم پیوست — بشکستنِ آں روا نمیدارد دست
چندیں سر و پائے نازنیں از وے ست — بر مہر کہ پیوست و بکیں کہ شکست

آنرا کہ بصحرائے عدل تاختہ اند، — بے او ہمہ کار ہا بپرداختہ اند
امروز بہانۂ در انداختہ اند — فردا ہمہ آں بود کہ در ساختہ اند

---

[1] یہ رباعی حمداللہ مستوفی نے بھی دی ہے وہاں تیسرا مصرع بالکل دوسری طرح ہے اور چوتھے میں ایک لفظ کا فرق ہے، فروغی اس رباعی کو قطعاً نظر انداز کر گئے ہم نے اسے رباعیوں کی گنتی میں شامل نہیں کیا ہے۔ [2] رباعی سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق راوندی کی "راحت الصدور" میں موجود ہے۔ جو ہم پہلے درج کر چکے ہیں۔ [3] رباعی تاریخ جہانکشا میں موجود ہے جسے ہم نے نقل کر دیا ہے۔ دیکھئے نمبر ۸۔ پہلے اور آخری مصرعوں میں خفیف سا اختلاف ہے

خورشید بگل نہفت می نتوانم — واسرار زمانہ گفت می نتوانم
از بہرِ تفکرم بر آورد خرد — دُرّے کہ زبیم سُفت می نتوانم

رفتم کہ درین منزل بیداد بُدن — در دست نخواہد بجز از باد بُدن
آنرا باید بمرگ من شاد بُدن — کزدست اجل تواند آزاد بُدن

چوں روزے وعمر بیش وکم نتواں کرد — دل را بچنیں غصہ دژم نتواں کرد
کارِ من و تو چنانکہ رائے من وتست — از موم بدست خویش ہم نتواں کرد

زآوردنِ من نہ بود گردوں را سود — وز بردنِ من جاہ وجمالش نفزود
وزہیچ کسے نبود و گوشم نشنود — کآوردن و بردن من از بہر چہ بود

مشنو سخن از زمانہ سازآمدگاں — می خواہ مروّق بطراز آمدگاں
رفتند یکاں یکاں فراز آمدگاں — کس می ندہد نشاں زباز آمدگاں

۳۳/۳۶

درکارگہ کوزہ گرے رفتم دوش — دیدم دو ہزار کوزہ گویا دخموش
ازدستۂ ہر کوزہ بر آوردہ خروش — صد کوز گرد کوزخرد کوزہ فروش

برگیر پیالہ و سبوائے دلجوئے — تا بجزا میم گردِ باغ ولب جوئے
بس شخص عزیز را کہ چرخِ بدخو — صد بار پیالہ کرد وصد بار سبوئے

ازکوزہ گرے کوزہ خریدم بارے — آں کوزہ سخن گفت زہر اسرارے
شاہے بودم کہ جامِ زرّ نیم بود، — اکنوں شدہ ام کوزۂ ہر خمّارے

ایں کوزہ کہ آبخوارۂ مزدوریست — ازدیدۂ شاہیست ودلِ دستوریست
ہر کاسۂ مے کہ درکفِ مخموریست — از عارضِ مہتے ولب مستوریست

۳۷/۴۲

عالم[1] اگر از بہرِ تو می آرایند — مگرائے بداں کہ عاقلاں نگرایند
بسیار چو مارو ند دبسیار آیند — بر بائے نصیب خویش کت بربایند

چوں[2] روزے وعمر بیش وکم نتواں کرد — خود بہ کم وبیش دژم نتواں کرد،
کارِ من و تو چنانکہ رائے من وتو — از موم بدست خویش ہم نتواں کرد

وقتِ سحر است خیز اے مایۂ ناز — نرمک نرمک بادہ خور وچنگ نواز
کانہا کہ بجایند نپایند بسے — وانہا کہ شدند کس نمی آید باز

چوں نیست مقام ما دریں دہر مقیم — پس بے مے ومعشوق خطائے است عظیم
تا کے زقدیم و محدث امید وبیم، — چوں من رفتم جہاں چہ محدث چہ قدیم

---

[1] ۱۹۳۱ء ۔ ۱۹۳۲ء میں قزوینی کو ایک مجموعۂ اشعار ملا جس کا نام "مونس الاحرار فی دقائق الاشعار" ہے اس میں خیام کی ۱۳ رباعیاں دی گئی ہیں جن میں سے ۲ ہمارے پچھلے مآخذ میں موجود ہیں اس کی کتابت ۷۴۱ھ کی ہے یعنی نزہت المجالس سے دو سال بعد۔ ہمارے یہاں یہ رباعیاں نمبر ۳۰ سے نمبر ۴۲ تک ہیں۔

[2] یہ رباعی "زینت المجالس" کی رباعیوں میں موجود ہے۔

چوں ابر بنوروز رخِ لالہ بشُست — برخیز و بجام بادہ کن عزمِ درست
کایں سبزہ کہ امروز تماشاگہ ماست — فردا ہمہ از خاک تو برخواہد رست

برسنگ زدم دوش سبوئے کاشی — سرمست بُدم چو کردم ایں او باشی
با من بزبانِ حال می گفت سبو — من چوں تو بُدم تو نیز چوں من باشی

یک قطرۂ آب بود با دریا شد، — یک ذرّۂ خاک باز میں یکتا شد
آمد شدن تو اندریں عالم چیست — آمد مگسی پدید و ناپیدا شد

۴۳/۴۴

ایام[1] زمانہ از کسے دارد ننگ، — کو از غم ایام نشنید دلتنگ،
مے خور تو در آبگینہ و نالہ چنگ — زاں پیشتر کہ آبگینہ آید بر سنگ

ایں بحرِ وجود آمدہ بیروں زہفت — کس نیست کہ ایں گوہرِ تحقیق بسفت
ہر کس سخنے از سرِ سودا گفتند — زاں روئے کہ ہست، کس نمیداند گفت

اے پیرِ خردمند بگہ تر برخیز — واں کودک خاک پز را بنگر تیز
پندش دہ و گو کہ نرم ترمک می پز — مغز سرِ کیقباد و چشم پرویز

دوری[2] کہ در آمدن و رفتنِ ماست — او را نہ نہایت نہ بدایت پیداست
کس می نزند دمے دریں معنی راست — کایں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

مے خور کہ فلک بہرِ ہلاک من و تو — قصدے دارد بجانِ پاکِ من و تو
در سبزہ نشین و مئے روشن میخور — کایں سبزہ بسے دمد ز خاک من و تو

اے آنکہ نتیجۂ چہار و ہفتی، — وز ہفت و چہار دائم اندر نفتی
مے خور کہ ہزار بار پیشت گفتم، — باز آمدنت نیست چو رفتی رفتی،

۴۸/۵۱

آنہا[3] کہ کہن شدند و آنہا کہ نوند — ہر کس بمراد خویش یک یک بروند
ایں کہنہ جہاں بکس نماند باقی — رفتند و رویم و دیگر آیند و روند

آیند یکے و دیگرے برہایند — بر ہیچ کسے راز ہمی نگشایند،
ما را ز قضا جز ایں قدر ننمایند — پیمانۂ عمر ماست می پیمایند

از جرمِ گلِ سیاہ تا اوجِ زحل — کردم ہمہ مشکلات کلّی را حلّ
بگشادم بندہائے مشکل بجمل — ہر بند گشادہ شد بجز بندِ اجل

---

[1] = وہی مشہور رُباعی ہے جس میں خیام کے پرستاروں نے ایام کو خیام بنا دیا ہے

[2] خفیف سے فرق کے ساتھ یہی رُباعی مرصاد العباد میں نقل ہوئی ہے جس کا حوالہ ہم دے چکے ہیں۔ [3] سعید نفیسی نے ۱۹۳۰ء ۔ ۱۹۴۰ء میں کتابخانۂ مجلسِ شورائے ملّی میں ایک بیاض دریافت کی جس کا سالِ کتابت ۸۵۸ھ تھا یعنی "مونس الاحرار" کے ۹ سال بعد لکھی گئی تھی اس میں گیارہ رباعیاں خیام کے نام سے شامل ہیں۔ جو ہمارے یہاں ۴۸ سے ۵۶ تک ہیں یعنی صرف ۹ ۔ کیونکہ اس میں کی دو رباعیاں "مونس الاحرار" میں پہلے آچکی ہیں۔

برخیز بتا بیا بہرِ دلِ ما — حل کن بجمال خویشتن مشکلِ ما
یک کوزہ شراب تا بہم نوش کنیم — زاں پیش کہ کوزہ ہا کنند از گلِ ما

۵۲
۵۲

اے دوست حقیقت شنو از من سخنے — با بادۂ لعل و با سیم تنے
کاں کس کہ جہاں کرد فراغت دارد — از سبلت چوں چوں تو ئے و ریش چو منے

۵۳
چوں نیست مقام ما در ایں دہر مقیم — پس بے مئے و معشوق خطائیست عظیم
تا کے ز قدیم و محدث اے مردِ سلیم — چوں من مردم جہاں چہ محدث چہ قدیم

آں مایہ ز دنیا کہ خوری یا پوشی — معذوری اگر در طلبش میکوشی
باقی ہمہ رائگاں نیرزد ہشدار، — تا عمرِ گرانبہا بکاں نفروشی

گرچہ غم و رنجِ من درازی دارد — عیش و طربِ تو سرفرازی دارد
بر دہر مکن تکیہ کہ دورانِ فلک، — در پردہ ہزار گونہ بازی دارد

از رنج کشیدن آدمی حُر گردد — قطرہ چو کشد حبس صدف دُر گردد
گر مال نماند سر بنا داد بجائے — پیمانہ چو شد تہی دگر پُر گردد

۵۴
بر چشمِ تو عالم ار چہ آرائید — مگرائے بدو کہ عاقلاں نگرائید
بسیار چو تو شد ندیسیار آئید — بر بائے نصیبِ خویش کت برپائید

برخیز ز خواب تا شرابے بخوریم، — زاں پیش کہ از زمانہ تابے بخوریم
کایں چرخِ ستیزہ روی ناگہ روزے — چنداں ندہد اماں کہ آبے بخوریم

۵۵
۵۱

۵۶
از جملۂ رفتگاں ایں راہ دراز — باز آمدہ کیست تا بما گوید راز
پس بر سرِ ایں دو راہۂ آزو نیاز، — تا ہیچ نمانی کہ نمی آئی باز

آنی کہ نبودت بخود خواب نباز — کردند نیاز مدت ایں چارانباز
ہر یک بتو آنچہ داد بستاند باز — تا باز چناں شوی بود زاغاز

بر پشتِ من از زمانہ تو میآید — وز من ہمہ کار نانکو میآید
جاں عزم رحیل کرد و گفتم بمرو — گفتا چکنم خانہ فرو میآید

بردار قرابہ و سبو اے دلجوئے — فارغ بنشیں بہ کشت زار و لب جوئے
بس نفسِ عزیز را کہ ایں چرخِ کبود — صد بار قرابہ کرد و صد بار سبوئے

---

۱ یہ رباعی خفیف سے فرق کے ساتھ "مونس الاحرار" میں موجود ہے جو ہم نقل کر چکے ہیں۔ ۲ یہ رباعی بھی "مونس" میں آچکی ہے۔
۳ فروغی کے ہمکار ڈاکٹر قاسم غنی کو ایک "مجموعۂ تذکرہ" ملا جس میں منسب شاعر متقدمین میں سے ہیں، فردوسی سے سعدی تک لیکن خواجہ حافظ کا ذکر نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب حافظ سے پہلے کا ہے تحریر، انداز تحریر، اور رسم خط سے اندازہ پایا جاتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری سے بعد کا نہیں اور اگر "مونس" وغیرہ سے تقدم نہیں تو معاصر ضرور ہے مزید براں رباعیوں کے مضمون میں خیالی نہیں۔ رباعیاں ۴۸ تا ۵۱ — ۵ یہ رباعی "نزہت المجالس" کے حوالہ سے ہم پہلے دے چکے ہیں۔

گر شاخِ بقا ز بیخ بختت رستست در برتنِ تو عمر لباسے چستست،
در خیمۂ تن کہ سایہ بانیست ترا باں تکیہ مکن کہ چار میخش سستست،

۴۱

قومے[1] متفکرند اندر رہ دیں قومے بگماں فتادہ در راہِ یقیں
میترسم از آنکہ بانگ آید روزے کاے بیخبراں راہ نہ آنست نہ ایں،

قانع بیک استخواں چو کرکس بودن بہ زانکہ طفیل خوان ناکس بودن
بانانِ جویں خویش حقا کہ بہ است کالودہ بپالودۂ ہر خس بودن

تا چند کنی خدمت دونان و خساں جاں بر سرِ ہر طعمہ منہ چوں مگساں
نانے بدو روز خور مکش منت کس خون دلِ خود خوری بہ از نانِ کساں

یک نان بدو روز اگر شود حاصل مرد وز کوزہ شکستۂ دمے آبے سرد
مامور کم از خودی چرا باید بود یا خدمت چوں خودی چرا باید کرد

اے دیدہ اگر کور نۂ گور ببیں، ویں عالم پر فتنہ و پر شور ببیں
شاہاں و سراں و سروراں زیر گلِ اند روہائے چو مہ در دہنِ مور ببیں

اے دل غم ایں جہانِ فرسودہ مخور بیہودہ نہ ای غمانِ بیہودہ مخور
چوں بودہ گزشت و نیست نابودہ پدید خوش باش و غم بودہ و نابودہ مخور

بر چرخِ فلک ہیچ کسے چیر نشد، وز خوردنِ آدمی زمیں سیر نشد
مغرور بدانی کہ نخورد دست ترا تعجیل مکن ہم بخورد دیر نشد

چوں نیست زہر چہ ہست جز باد بدست چوں ہست بہر چہ ہست نقصان و شکست
انگار کہ ہر چہ ہست در عالم نیست پندار کہ ہر چہ نیست در عالم ہست

حیّی کہ بقدرت سرو رومی سازد ہموارہ ہمو کار عدو می سازد
گویند فرا بہ گر مسلماں نبود، او را تو چہ گوئی کہ کدو می سازد

در[2] دائرۂ کہ آمد و رفتن ماست آنرا نہ ہدایت نہ بدایت پیداست
کس می نزند در اہلِ جہاں یکدم راست کیں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

۴۲

سیر[3] آمدم اے خدائے از ہستیٔ خویش از تنگ دلی و از تہی دستیٔ خویش
از نیست چو ہست میکنی بیروں آر زیں نیستیم بحرمتِ ہستیٔ خویش

(محمد سمرقندی کے "سندنامہ" میں بھی خیام کی ۵ رباعیاں موجود ہے یہ ۵۵۶ھ کی تصنیف ہے، افسوس، یہ مضمون لکھتے وقت ہم ان رباعیوں کو نقل نہ کر سکے)

---

[1] قزوینی اور ڈاکٹر قاسم غنی کی ان "دریافتوں" میں بعض ایسی رباعیاں ملیں جن کے کہنے والوں کا نام درج نہیں کیا گیا ہے لیکن جن میں سے اکثر خیام کے دوسرے مجموعوں میں مل جاتی ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان رباعیوں ہی کی جو تعداد میں دس ہیں، دسویں رباعی "مرصاد العباد" میں خیام کے نام سے درج ہے۔ اس سے ہمارا شبہ یقین کی حد تک پہونچ جاتا ہے اور ان رباعیوں کو جو اپنے مضمون کے اعتبار سے بھی قطعاً خیامی ہیں خیام کی ملکیت سے خارج میں کوئی شک نہیں رہتا۔

[2] یہ رباعی "مرصاد" میں موجود ہے اور نقل کی جا چکی ہے — [3] مولانا خسرو البرقوہی کی "فردوس التواریخ" میں جو ۸۰۶ھ کی تالیف ہے، خیام کی دو رباعیاں [illegible] یہ ایک رباعی جو تمام تر مستند ہے اور دوسری یہ ۔۔۔ نہ معلوم اس رباعی کو فروغی نے بغیر کسی معقول وجہ کے کیوں مشکوک ٹھہرایا ہے۔

ان ۲، رُباعیوں کے مطالعہ سے (جن میں سندنامہ کی ۵ رباعیاں شامل نہیں ہیں) جو یقیناً خیام کی ہیں اور جنھیں ہم مآخذ کے حوالوں کے ساتھ پیش نقل کر رہے ہیں، خیام کی فکر اس کے اسلوبِ ادا، رنگِ شاعری، اور طرزِ سخن کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انھیں پڑھکر ہم کلام خیام کی خصوصیات تعین کر کے ایک معیار یا کسوٹی بنا سکتے ہیں جس پر خیام کی طرف منسوب دوسری رباعیوں کو پرکھ سکتے ہیں۔

اس کلام کی سب سے نمایاں اور پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بے حد سادہ اور بے آرائش ہے، ہر قسم کے تکلف یا تصنع اور تخیلاتِ شاعرانہ سے ری اور مجموعی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ از قسمِ شاعری، ان میں سوائے وزن اور قافیہ کے کچھ بھی نہیں۔ تاہم فصاحت اور بلاغت میں اپنی انتہا پہونچا ہوا ہے الفاظ اور معانی ایک ہو گئے ہیں۔ بہت کم الفاظ بھرتی کے طور سے استعمال ہوئے ہیں ایسے ہی بہت کم جگہ کسی لفظ کی کمی محسوس ہوتی ہے ابتذال یا ناقص انداز بیان کہیں نہیں — بس ہر جگہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کہنے والا لفاظی اور چرب زبانی پسند نہیں کرتا سیدھے سادے طریقے سے اصل بات کہدینا چاہتا ہے اکثر اوقات یہ بات بڑی دلچسپ دقیق اور بدیع ہوتی ہے۔ پورے کلام میں کہیں ہزلیہ انداز نہیں ملے گا کہیں کہیں بے حد نازک ظرافت ضرور ہے — اندازِ بیان نرمی لئے ہوئے ہے لیکن زنانہ پن نہیں۔

جہاں تک رباعیوں کے مضامین کا تعلق ہے سب کے سب ایک متجسس حکیم اور مفکر کا نتیجۂ طبع معلوم دیتے ہیں۔ ایسا مفکر جو کائنات کا معمہ حل کرنے کی فکر میں ہے جو تکوینِ عالم کا راز اور تقدیرِ انسانی کی کنہہ تک پہونچنا چاہتا ہے، وہ راز جو موت چھپائے بیٹھی ہے وہ اسے زندگی ہی میں پالینے کے لئے مضطرب ہے۔

یہ مفکر انسانی زندگی کی ناپائداری اور 'سامانِ جہاں' کے 'ہیچ' ہونے پر متاسف بھی ہے متاثر بھی، جوانوں اور نازنینوں کی موت پر افسردہ ہے، حسن، نفاست اور پاکیزگی کے لئے وہ بڑا ذکی الحس ہے اور اس کے احساس میں شدت بھی بلا کی ہے، وہ ان سب سے پیار کرتا ہے مگر جانتا ہے کہ ان کا وجود اور ساتھ ہی خود اس کا اپنا وجود دوامی نہیں اس بات پر وہ اکثر جھنجھلا بھی اٹھتا ہے مگر پھر ہوش کی دنیا میں آجاتا ہے اور کہتا ہے اتنی عمر بھی غنیمت جاننا چاہئے جسے سلیقہ سے گزار دیا جائے۔ ایک بار گئے تو پھر تو کبھی بھی ادھر کو آنا ہی نہیں ہے — جینے کا وہ سلیقہ کیا ہے جس کے ذریعہ 'رختِ عمر' کو جس کا نے 'ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں' رام کر کے سکون کی زندگی گزر جائے اور اطمینان موت آئے۔ اس کے لئے اس نے کچھ اصول بتائے:-

ہمیشہ خوش رہو۔ کسی کے ساتھ برائی مت کرو۔ حرص و آز سے جہاں تک ہو سکے بچو۔ قناعت سیکھو جو اپنی جگہ پر بادشاہت ہے۔ دوسروں کے مقابلہ میں خود کو حقیر نہ کرو۔ کوتاہ نظروں کے افکار اور ان کی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کو جو دنیاوی ہوں یا اخروی نیچا سمجھو۔ بلند ہمت کے ساتھ جیو۔

جاہ و جلال، حسن و جمال، قدرت و شوکت، غرور تمکنت، عیش و طرب یہ سب کے سب بے بنیاد اور ناپائدار ہیں۔ سب مرجاتے ہیں اور خاک ہو جاتے ہیں اور پھر اسی خاک سے اینٹیں اور کوزے بنتے ہیں —— اور موت کے سامنے امیر اور غریب بڑے اور چھوٹے سب برابر ہیں۔ جب ایسا ہے تو دنیا سے دل کیوں لگاؤ اور کسی بھی جانے والی چیز پر غرور کیوں کرو۔

یہ سب پند و حکمت، یہ سب عبرت کی باتیں ان رباعیوں میں ہیں لیکن کسی بات پر نصیحت کی تلخی نہیں ہے سب کچھ مئے و معشوق اور سبزہ و گل کے پیرایہ میں کہا گیا ہے۔

ان باتوں کے علاوہ اس کے یہاں نہ مدح و ذم ہے نہ مغازلہ و معاشقہ، وہ نہ فراق پر روتا ہے نہ وصال سے خوش ہوتا ہے، نہ وعظ کہتا ہے نہ مناجات، نہ آہ و زاری کرتا ہے نہ عارفانہ باتیں۔ وہ تو ہر وقت کائنات کے راز کی تہ تک پہونچنے کی فکر میں ہے۔ ہم کیوں آئے اور کیوں چلے جاتے ہیں؟ کوئی بھی حقیقت تک نہ پہونچ سکا اور اس شبِ تاریک سے باہر نہ آسکا۔ سب افسانے کہتے رہے اور لوگوں کو سلاتے رہے اور آخر خود بھی ہمیشہ کے لئے سو گئے۔

یہ ہے خیام کی فکر اور اس کے اسلوب کا خلاصہ۔ جس پر پروفیسر آربری کے ترجمہ سے مزید روشنی پڑتی ہے، کاش اصل رباعیاں بھی

شایع کردی جاتیں۔

اب تک خیام کی جو تصویر ہمارے سامنے پیش کی جاتی رہی ہے وہ اصل خیام ہرگز نہیں وہ نہ تو رندِ بدمست بھانہ خرقہ پوش صوفی۔ زاہدِ خشک نے اُسے صوفی بنا ڈالا اور رندوں نے بادہ خوار۔ اور پھر اس کی رباعیوں کے ساتھ مختلف قصّے تصنیف کر ڈالے یہاں تک ہوا کہ رباعی اور قصے ساتھ ساتھ گھڑے گئے۔ یہ دو رُباعیاں،

ابریق مئے مرا شکستی ربّی، برمن در عیش را ببستی ربّی
من مے خورم و میکنی بدمستی خاکم بدہن مگر تو مستی ربّی
ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو آنکس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی پس فرق میاں من و تو چیست بگو

اور اس کے ساتھ کی مشہور حکایت پڑھئے تو لطف آجائے گا اور لطف یہ ہے کہ خود یہ دونوں رباعیاں غریب خیام نے نہیں کہیں بلکہ کسی قدر دان کی عنایت ہے۔ وہ لوگ جو اُسے میخوار، بداعتقاد اور دہریہ سمجھے انھوں نے اس کے اشعار کی اسپرٹ کو مجروح کر ڈالا، خیام نے ایسے ہی گروہ کے متعلق کہا ہے:-

با ایں دو سہ ناداں کہ چنیں میدانند از جہل کہ دانائے جہاں ایشانند
خر باشں کہ ایں جماعت از فرط خری ہر کو نہ خراست کافرش میخوانند

خود خیام کے بزرگ معاصروں نے اسے بڑے احترام اور ادب سے یاد کیا ہے اور اسے امام اور حجت الحق جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔ خیام تو محض ایک مفکر تھا، اسلامی علوم کی اصطلاح میں ایک حکیم، جس کے کلام کی اصل اسپرٹ 'جستجو' ہے، 'میں کیا ہوں' 'یہ سب کیا ہے'، 'میں کس لئے آیا ہوں' 'کہاں ہوں' 'بالآخر کہاں جاؤں گا؟' ان سوالات کے جواب سوچنے اور ان مسئلوں کو سمجھنے کی اپنی حد تک کوشش کی، نزع کے عالم میں خیام کی زبان پر جو الفاظ جاری تھے، جنھیں بیہقی نے نقل کیا ہے وہ اگر صحیح نہ بھی ہوں تو بھی خیام کی اصل اسپرٹ کو مکمل طور سے ظاہر کرتے ہیں:-

"پروردگار! تو جانتا ہے کہ اپنے امکان بھر میں نے تجھے جانا ہے، مجھے معاف کرنا کہ تیرے لئے میری یہ جستجو ہی تیرے پاس آنے کا اور تجھ تک پہونچنے کا وسیلہ رہے"

خیام رند و میخوار نہیں تھا لیکن وہ صوفیِ خانقاہ بھی نہ تھا۔ 'مئے دوسالہ' اس کے یہاں یقیناً قرآن کے ہم معنی نہیں نہ 'محبوب چہاردہ سالہ' سے اس نے رسول اکرم کی ذات مراد لی ہے لیکن شراب سے فراغِ خاطر، مسرت و خوشی اور کسی قدر، رواجی پابندیوں کی شکست یقیناً مراد لی جاسکتی ہے اور خیام نے اسے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ خیام کو اسی اسپرٹ میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

(خیام کے یہاں الحاقی کلام کے بارے میں مستشرقین کافی لکھ چکے ہیں۔ آخری کام خود مشرق والوں نے کیا سید صاحب مرحوم کی 'خیام' اور فروغی ایڈیشن میں کافی اشارے ملجاتے ہیں۔ فروغی نے ایک خاص چیز کی طرف توجہ دلائی۔ کرسٹنسن کے مقلدین عام طور سے ہر اس رُباعی کو خیام کی ملکیت تسلیم کر رہے تھے جس میں خیام کا تخلص آیا ہو، فروغی نے متعدد ایسی رباعیاں پیش کیں جو جعلی تھیں اور جن میں خیام کا نام شامل تھا اس طرح یہ بات کوئی ضروری نہیں رہی کہ خیام کا نام جس رُباعی میں ہو وہ لازماً خیام ہی کی ہو۔ خیام کے قدردان اس معاملہ میں کافی ہوشیار رہے ہوں گے اور کسی رباعی کی سند انتہائی ثقہ ٹھہرانے کے لئے ان کے پاس اس سے اچھی راہ کوئی نہ ہوگی کہ خیام کا تخلص رباعی میں ڈال دیا جائے۔ اور حکیم نیشاپور نے بہت ممکن ہے کہ کبھی بھی خود کو خیام نہ لکھا ہو اس لئے کہ یہ نام تو اس کے باپ ابراہیم کے نام کے ساتھ بولا یا لکھا جاتا تھا)

یادِ پاستین

جنوری ۳۳ء

حضرت جوشؔ کا ایک خط علی اخترؔ کے نام

اب سے بائیس سال پہلے کی بات ہے جب حضرت جوشؔ ملیح آبادی اور علی اخترؔ دونوں حیدرآباد میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم ہیں اور یہ زمانہ ان دونوں کی شاعری کے شباب کا ہے۔ میں بھی اتفاق سے اسی زمانہ میں وہاں پہونچتا ہوں اور ان دونوں کی شاعری کا تقابلی مطالعہ دسمبر ۳۲ء کے نگار میں شایع کرتا ہوں۔ اس کو دیکھ کر حضرت جوشؔ، علی اخترؔ صاحب کو ایک خط لکھتے ہیں، جس کا مطالعہ آج بھی لطف سے خالی نہیں، کیونکہ اس وقت پھر جوشؔ اور علی اخترؔ کا اجتماع کراچی میں ہوگیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"میاں لڑکے تم کن ہاتھوں میں کھیل رہے ہو، ان ہاتھوں کو تمھیں مس کرنے کا کوئی حق نہیں، یہ بات ناپاک ہیں، اچھے بچے، تم اس گود سے اُتر آؤ یہ کھلائی بڑی علامہ ہے، تمھیں بُری بُری باتیں سکھا دے گی، — سنتا ہوں تم اس مضمون سے بہت خوش ہو، پھولوں نہیں سماتے، اس مضمون کے کھلونے کو تم لئے لئے پھرتے ہو، یہ دیکھو ہمارا اچھا اچھا کھلونا، اتانے دیا ہے، اور کھیلتے اکثر منہ میں بھی رکھ لیتے ہو۔ استغفراللہ۔ تم جانتے ہو یہ ساری اُچھل کود کس بات کی ہے؟ میاں آنکھیں کھولو، یہ تمھاری محبت نہیں، میری عداوت ہے جسے حسبِ علی سمجھے ہوئے ہو، وہ بغضِ معاویہ ہے، سمجھے؟ میری ننھی سی جان! سمجھے؟

ارے یہ مضمون، یہ مضمون۔ توبہ، توبہ۔ لکھنے والے نے اتنا بھی انتظار نہیں کیا کہ جوش پر آیا ہوا غصہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو لکھوں، ورنہ مضمون کی غایت ہی مفقود و معدوم ہو جائے گی، کیا اہلِ دُنیا اتنے اُلّو کے پٹھے ہیں کہ اس مضمون کی روح تک آن کی آن میں نہ پہونچ جائیں گے، اور کان کھڑے کر کے یہ سوال نہ کریں گے کہ دیوانے کو کس نے چھیڑ دیا ہے کہ غصہ میں چیخیں مار رہا ہے،

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس مضمون میں عناد کی آگ بھڑکی ہوئی ہے، سطریں غصہ سے اکڑی نظر آرہی ہیں، الفاظ کا منہ بسورا ہوا ہے، دائرے کف در دہاں ہیں، اور کشتیں بارِ غیظ سے دُہری ہوئی چلی جاتی ہیں۔

اس مضمون کی علت یہ ہے کہ (۱) اس خطا پر کہ میں صاحبِ مضمون کو حقیر و فرومایہ سمجھتا ہوں، مجھے نظروں سے گرا دیا جائے (۲) میری اور تمھاری جدائی ہو جائے، یہ دوسری مد شاید تمھاری سمجھ میں نہ آئے، اس لئے کہ تم اس بے پایاں خباثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ بعض لوگوں کو دو دوستوں میں نفاق ڈال دینے سے مزا آتا ہے۔

میاں اخترؔ، تم جانتے ہو میں تمھارا ہمیشہ سے مداح رہا ہوں، میں تمھارے شاعرانہ جوہروں کا دل سے قدرداں ہوں، اور ہمیشہ رہوں گا، میں تمھارا ہوں، تم میرے ہو —— اچھے بچے! یہ تحریر جا کر صاحبِ مضمون کے منہ پر مار کہ جوشؔ کی یہ تحریر ہے وہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتا، ہم اتنے لونڈے نہیں کہ ایک کو ایک پر ترجیح دینے سے ہم قلانچیں مارنے لگیں، ہپ ہپ ہرا کرنے لگیں۔ شاعری ان مہمل بازیوں سے بہت بلند ہے، اگر شاعری کسی کو لے کر اُڑ رہی ہے تو کوئی قوت اُسے گرا نہیں سکتی، چاند چمکتا رہتا ہے، کتے بھونکتے رہتے ہیں، البتہ اگر کسی کی شاعری ہی کمزور ہے تو تمام دنیا کی تھوتھیاں اس کے لئے بیکار ہیں، اُسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا صاحبزادے، تمھیں مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا، میں کبھی تمھارا مقابلہ نہیں کروں گا "خاک کھاؤں، دھول کھاؤں، کیا بھانجے کو کھا جاؤں

کیا میں اُس دروسے بھی گیا گزرا ہوں'

نیاز مند جوش "نابغۂ دوم"

ارے ہنسی کے مارے دم نکلا جاتا ہے، "نابغہ" "نابغہ" اُف کوئی گدگدائے ڈالتا ہے، ارے مرا مرا مرا، یہ بلغمی آواز کہاں سے آرہی ہے، دیکھو کوئی افیونی تو جاں بحق تسلیم نہیں ہو رہا ہے"۔

اپریل سنہ ۱۹۲۹ء ۔ اشتراکیت کیا چیز ہے، اس کی تاریخی قدامت کیا ہے اور یہ کہ ہندوستان یا کسی اور متمدن ملک میں اس کا رواج مناسب ہے یا نہیں، نگار کی اولین اشاعت میں، اس موضوع پر میں نے روشنی ڈالی تھی، اور اس وقت بھی بحالات موجودہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس یاد کو تازہ کیا جائے۔ کمیونزم (COMMUNISM) جسے سوشلزم (SOCIOLISM) بھی کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ اشتراکیت کیا جاتا ہے، اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے نہایت دلکش چیز معلوم ہوتی ہے کیونکہ تمام افراد انسانی کا ہر چیز میں مشترک رہنا فطرت کے تمام انعامات سے یکساں طور پر فایدہ اُٹھانا، جو مفہوم اشتراکیت کا ہے ایک ایسا دلچسپ مطالبہ ہے کہ کوئی شخص جو انسانیت اخوت عامہ اور امن عام کی حکومت دیکھنا چاہتا ہے وہ بغیر ایک لمحہ تامل کئے ہوئے اس مطالبہ کے استحسان پر فتویٰ دیدے گا لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے یعنی جس حد تک اشتراکیت کے قابلِ عمل و نفاذ پذیر ہونے کا واسطہ ہے، یہ مطالبہ اس قدر آسان و خوشنما نہیں اور زمانۂ قدیم سے لے کر اسوقت تک جب کبھی اشتراکیت کا جذبہ دُنیا میں پیدا ہوا ہمیشہ اس کی مخالفت کی گئی اور کبھی اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔

اشتراکیت کی دو قسمیں ہیں: ایک "اشتراکیت محض" دوسرے "اشتراکیت تعاون" اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ تمام افراد انسانی متاعِ عالم میں برابر کے شریک ہوجائیں اور دوسرے سے مقصود یہ ہے کہ افراد انسانی تقسیم عمل کے تحت خدمات انجام دیں اور نفع میں سب کا حصہ برابر ہو۔ الغرض اس کا نصب العین یہ ہے کہ جمہور کی مدد سے افراد انسانی کی عام حالت درست کی جائے۔

اشتراکیت دُنیا کا کوئی نیا خیال نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے جب سے ملوکیت یا تسلط کی بنیاد پڑی اور ہمیشہ یہی ہوا کہ جب اصحاب دولت یا سرمایہ داروں نے غریبوں پر ظلم شروع کیا، اشتراکی خیالات دنیا میں رونما ہونے لگے۔

یونان قدیم میں فالیاس کا اشتراکیت کو رواج دینا جس کے ذریعہ سے وہ تعلیم و معاشرت میں امیر و غریب دونوں کو دوش بدوش چلانا چاہتا تھا، تاریخ کا کھلا ہوا واقعہ ہے اور افلاطون کا یونانی جمہوریت کو ترتیب دینا جس میں زمین، عورت اور غلام کو مشترک ملکیت قرار دیا گیا تھا، اہلِ علم پر واضح ہے۔

قبل مسیح دوسری صدی میں اسرائیلیوں کی ایک جماعت جو فرقۂ اسینیہ (ESSEMES) کے نام سے موسوم تھی بحر مردہ (DEADSEA) کے ساحل پر آباد تھی، ان کے ہاں بھی سب لوگ مال میں شریک تھے یہاں تک کہ عورت کو بھی مال ہی سمجھا جاتا تھا اور وہ بھی مشترک چیز سمجھی جاتی تھی۔ یہی حال ایک مسیحی جماعت کروکراٹیانا کا تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں معدوم ہوگئی، ہالینڈ میں بھی متعدد جماعتیں اشتراکی اصول پر قایم ہوئیں جن میں سے بہت زیادہ شہرت اس جماعت کو حاصل ہوئی جسے جرار گروٹ نے ۱۳۷۸ء میں قایم کیا تھا، دوسری صدی عیسوی میں ایک گروہ اڈیٹا نمودار ہوا جو راستوں پر برہنہ پھرتا تھا اور عورت پر اس کے مشترکہ حقوق قایم تھے۔

جرمنی کے عہدِ اصلاح میں کاشتکاروں نے زمینداروں کو مجبور کیا کہ زمین میں اُنھیں برابر کا حصہ دیں، جس پر سخت خونریز لڑائی ہوئی جو "جنگِ مزارعین" کے نام سے مشہور ہے۔ ایسے واقعات بھی تاریخ میں ملتے ہیں کہ مسیحی جماعتوں نے مالداروں پر زور ڈالا کہ وہ اپنی دولت فقراء پر برابر تقسیم کردیں۔

الغرض ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اشتراکی خیالات پیدا ہوئے، دولت و حکومت نے ان کا مقابلہ کیا اور اس تصادم نے دنیا میں بہت کچھ اضطراب پیدا کیا۔ اشتراکی اصول پر عہدِ وسطیٰ میں متعدد کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب سارنو میں مور کی ہے جو

۱۵۱۶ء میں طبع ہوئی تھی۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ متمدن دنیا میں اشتراکی جماعت کی تعداد ہمیشہ بڑھتی ہی گئی اور حکومت اس کو فنا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ فرانس میں بھی زمانۂ قدیم میں اصول اشتراکیت قایم ہوئے۔ اور بابوف نے تو نظام حکومت اُلٹ دینے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس کے متبعین میں اختلاف پیدا ہوگیا اور یہ تحریک خود فنا ہوگئی۔

اٹھارویں صدی میں سان سیمون فرانسیسی نے ایک نیا مذہب نکالا جسے وہ نصرانیت جدید کہتا تھا اور اپنے اصول مخترعہ کے ذریعہ سے وہ عقاید مذہب و سیاست کی اصلاح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی مرنے وفانہ کی اور اس کے تلامذہ میں باہم اختلافات پیدا ہو جانے کی وجہ سے حکومت نے اس انتشار سے فایدہ اُٹھایا اور ان کی قوت کو فنا کر دیا۔ اس کے بعد شارل فوریہ (۱۷۷۲ء - ۱۸۳۷ء) کا ظہور ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ ہیئت اجتماعی کی بنا دائمی ارتقاء پر ہے جس زمانہ میں فوریہ اور اس کے مقلدین ہیئت اجتماعی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے ایک اور شخص لوئی بلان نے اس امر پر زور دیا کہ حکومت تعین عمل اور تقسیم اُجرت کو اپنے ہاتھ میں لے، چنانچہ حکومت کی طرف سے اُجرت پر مزدور رکھے گئے، مگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ اور ملک میں صرف اشتراکی بغاوت پیدا ہوکر رہ گئی۔ بروڈان (۱۸۰۹ء - ۱۸۶۵ء) کا دستور العمل لوئی کے خلاف تھا، وہ کہتا تھا کہ حکومت کو وضع قوانین کا اختیار نہیں ہے۔ انگلستان میں رابرٹ اوین (۱۷۷۱ء - ۱۸۵۸ء) نے اشتراکی خیالات کی اشاعت شروع کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے بعد بہت سی اشتراکی جماعتیں قایم ہوئیں جن کی تعداد ۱۳۰۸ تک پہونچتی ہے ان میں سب سے زیادہ کامیاب انجمن راشڈیل تھی۔ اس نے اسباب تجارت کا ایک عام و مشترک ذخیرہ فراہم کیا تھا، چند سال کے عرصہ میں اس نے غیر معمولی ترقی کر لی اور ہر قسم کی تجارت اس کے ہاتھ میں آگئی مگر نتیجہ کے لحاظ سے یہ بھی بدقسمت ثابت ہوئی اور حکومت نے اس کو بھی فنا کر کے چھوڑا۔

اس وقت یورپ، امریکہ اور ایشیا میں بہت سی اشتراکی انجمنیں پائی جاتی ہیں اور اکثر "اشتراکیت تعاون" کے اصول پر قایم ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ کامیابی روس میں ہوئی اور اسی کی کامیابی نے روئے زمین میں پھر از سر نو اشتراکیت کے جراثیم پیدا کر دئے ہیں اور روز بروز ان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ چین کا موجودہ انقلاب اسی کا نتیجہ سمجھا جائے گا اور ہندوستان میں ایسی جماعتوں یا انجمنوں کا قایم ہو جانا بھی اسی کا پرتو ہے۔

اگست ۱۹۲۹ء — اوائل عمر اور زمانۂ طالب علمی میں، جس لکھنؤ کو میں نے دیکھا وہ موجودہ لکھنؤ سے بہت مختلف تھا۔ مولوی صدیق حسن غازی پوری میرے اتالیق ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے اور ہر چند یہ اپنے حلقۂ احباب میں بہت رنگین مزاج مشہور تھے، مگر میرے لئے وہ ایک مستقل بے آب و رنگ چیز تھے اور میری حالت ایک طائر پر بند سے زیادہ نہ تھی۔ اس لئے اگر کسی دن مجھ کو آزادی نصیب ہو جاتی تھی تو میں لکھنؤ کو حد درجہ حریص نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اس قلیل فرصت کو نتائج و مطالعہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر صرف قیاس و خیال سے کام لیکر رنگین بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی مجھے وہ نامعلوم سی کشش یاد ہے جو یہاں کی در و دیوار میں محسوس کرتا تھا اور ہنوز اس محبت کی لذت میرے دل سے محو نہیں ہوئی جو یہاں کی فضا سے پیدا ہوگئی تھی اور اس کو میری لکھنوی زندگی کا دور اولیں سمجھنا چاہئے۔

میری عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ سال کی ہوگی، فارسی ادبیات ختم کر چکا تھا، اور عربی کے درس نظامی کے نشاط کش مشغلہ کے باوجود ابھی تک عرفی و نظیری، غالب و بیدل میرے دل و دماغ پر مستولی تھے۔ میرے والد اُس وقت دولت گنج کے تھانہ میں انچارج تھے اور چونکہ خود فارسی کے اچھے ادیب شاعر تھے اور اپنے اخلاق و خصایص کی وجہ سے نہایت ہی دلچسپ و ہر دلعزیز انسان تھے اس لئے صبح و شام ایک اچھی خاصی مجلس شعراء امراء و ظرفاء کی برپا ہو جاتی تھی۔

الغرض وہ ماحول جو اوائل عمر میں یہاں پیدا ہوگیا تھا وہ میرے احساسات کے لحاظ سے ایسا پُر لطف تھا کہ ہر وقت میرے دماغ پر نشہ سا چھایا رہتا تھا اور لکھنؤ کی ساری فضا ایک خاص کیفیت میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھی۔

دن گزرتے گئے اور رفتہ رفتہ میری عمر کے ساتھ پابندیاں بھی کم ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جب مجھے بہہ
کہیں وہ تیسرا دور تھا جس نے مجھے بتایا کہ زندگی کسے کہتے ہیں، شاعری کا خلاق کیا ہے اور بہت سے شاعرانہ الفاظ و تراکیب
کیا ہو سکتا ہے۔

اس سے قبل فارسی ادبیات اور اُردو شاعری کا جو مطالعہ میں نے کیا تھا، وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی مرئی چیز کا درس صرف سامعہ کے ذریعہ سے دیا جائے۔ لیکن اب مجھے اجازت تھی کہ دیکھنے کی چیزوں کو دیکھوں، سننے کی باتوں کو سنوں، اور جو اشیاء چھونے کے لئے وضع ہوئی ہیں انھیں چھوڑوں۔ اس سے قبل میں غالب کی ایک مثنوی کا یہ شعر پڑھ چکا تھا

جلوہ گرے آفتِ نظارۂ برق ز تمثال وے انگارۂ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا استاد باوجود کوشش بلیغ کے مجھے کبھی نہ سمجھا سکا کہ جلوہ گری کا صحیح مفہوم کیا ہے اور "آفتِ نظارہ" کس نوع کا "آشوبِ چشم" ہے لیکن اب از خود نہ صرف اس کی حقیقت مجھ پر واضح ہو رہی تھی بلکہ

"قامتِ قامتاں مژگاں درازاں"

اور "زہرہ را اندر ربِ دائے نورِ عُریاں دیدام"

نشہ آور تجربات سے گزر رہا تھا۔

الغرض لکھنؤ کے مطالعۂ اولین کا آخری منظر جس طرح ختم ہوا وہ تو ایک ایسی چیز تھا جو ہر حال و صورت میں

دعوت برگ و نوائے کند

اور اس لئے جب میں یہاں سے جدا ہوا تو میری حالت ایسی تھی جیسے ساون میں کسی کی بینائی زایل ہو جائے، میں نے لکھنؤ کو اپنی عمر کے جس خوشگوار موسم میں اول اول دیکھا اُسے:

"زموج گل بہاراں بستہ زنار"

کہنا چاہیے اور اس کا تعلق بالکل خود فراموشانہ اور اس لئے غیر ذمہ دارانہ زندگی سے تھا۔ اس کے بعد بھی بارہا لکھنؤ آنے کا اتفاق ہوا لیکن بالکل مسافرانہ یا کبھی کبھی کسی خاص ضرورت سے مجبورانہ، جس کو شاعری یا شاعرانہ احساس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مرتبہ جب میں نے مستقلاً یہاں قیام کا ارادہ کیا تو حالات زندگی بالکل بدل چکے تھے، حیات کی مشکلات اور عاملانہ ذمہ داریوں نے بقول غالب:

"زدشواریِ زیستن مردۂ"

بیمار رکھا تھا ورنہ وہ فراغتِ خیال تھی، نہ آسودگیِ حال، نہ وہ جوشِ نشاط تھا، نہ وہ سن و سال، "فکرِ فضول" کی جگہ "غور و تامل" نے "جرأتِ رندانہ" کی جگہ "احتیاط مفکرانہ" نے لے لی تھی اور خیالات کے شیریں عالم سے ہٹ کر واقعات کی تلخ دنیا میں آگیا تھا۔ بہرحال اس مرتبہ میرا لکھنؤ آنا نہ عہدِ گزشتہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے تھا اور نہ اس کا ماتم کرنے کے لئے، بلکہ بجائے تماشائی کے، یہاں کی آبادی میں شامل ہو کر خود تماشہ بننے کے لئے۔

فلسفۂ مذہب

مولوی مقبول احمد صاحب کی وہ ہنگامہ خیز تصنیف جس نے علماء اسلام کی "کافر سازی" مجالس میں ہلچل ڈال دی تھی اس میں مذہب کی ابتدا و ضرورت مذہب، قومیت، قومیت و الٰہیات، مذہب و نبوت، مذہب و تکوین، مذہب و معاد، مذہب و تقدر، مذہب و اخلاق، مذہب و عبادات اور انجام مذاہب پر نہایت محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ

منیجر نگار لکھنؤ

بھوپال کی فضائے شاعری کا ایک نجم درخشاں

اختر بھوپالی

بھوپال کے موجودہ نوجوان شعراء کی فہرست کافی طویل ہے اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں، جن کا کلام قابل توجہ نہ ہو، لیکن جدید رجحانات اور زندگی کے نئے اقدار کے احساس کے ساتھ حسن تغزل اور والہانہ لب و لہجہ کے لحاظ سے ان سب میں اختر (اختر سعید خاں) کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ کافی تفصیل کی محتاج ہے، فی الحال اس اجمال کے ساتھ ہی ان کا کلام ملاحظہ فرمایئے تفصیل پھر سہی!

(نیاز)

کانٹوں کی خلش سے ہر لحظہ پھولوں کی طلب بڑھتی ہی گئی
ہر شاخ پہ کانٹے تھے نگراں ہر موڑ پہ کلیاں تھے لیکن

کچھ سوچ کے ہم نے کشتی کو گرداب کی جانب موڑا ہے
اے مطربِ امروز سنا اک عشرتِ فردا کا نغمہ

کل اس کی گلی میں اختر کو برگشتہ و حیراں دیکھ لیا،
جب بھی ہم تجھ سے نہ ملنے کی قسم کھاتے ہیں

اے دلِ منتظرِ یار تجھے کیا معلوم
اب نہ دیکھے گا ہمیں طعنۂ کفر و الحاد

سعیِ وفا اتنی بھی کب رائگاں،
ظرفِ دل و برقِ نظر الاماں،

یوں تو اندھیرا ابھی قیامت کا ہے،
ذوقِ طلب اور ذرا چند گام،

رہِ حیات میں جب تیری رہگزر آئی
اب آگے قافلۂ زیست کون روکے گا

غمِ حیات نے فرصت ذرا نہ دی لیکن
رموزِ عشق سے میں بے خبر نہیں مگر یہ کیا

خوشبو پھیلے گلشن گلشن دور رہے ویرانوں سے
جانے نہ جانے اس کو برہمن مانے نہ مانے شیخِ حرم

صحرا سے گزر کر دیوانہ نزدیک گلستاں آ ہی گیا
کلیوں نے چٹکنا سیکھ لیا پھولوں کو مہکنا آ ہی گیا

کیا غم جو کنارا چھوٹ گیا کیا فکر جو طوفاں آ ہی گیا
غمِ دل کا پرانا ساتھی ہے دل غم سے مگر اکتا ہی گیا

کس درجہ خرد پر نازاں تھا صد شکر کہ ٹھوکر کھا ہی گیا
اور بھی کچھ ترے نزدیک نظر آتے ہیں،

وہ سلاتے بھی ہیں جو نیند اڑا جاتے ہیں
لیجے ہم آپ پر ایمان لئے آتے ہیں

دوست ہے دشمن سے سوا بدگماں
آگ لگی اور نہ اٹھا دھواں

ہائے مگر رات کی تنہائیاں
اور ہے کچھ فاصلۂ درمیاں

زمین تھی مگر اک آسماں نظر آئی،
اجل کی راہ سے بھی زندگی گزر آئی

تمہاری یاد جو آتی تھی عمر بھر آئی
تمہارا نام سنا اور آنکھ بھر آئی

موجِ بہاراں چھیڑ نہ اچھی دیکھ نہیں دیوانوں سے
کعبے کو جو راہ گئی ہے گزری ہے بتخانوں سے

درد جھیلے مسکرا کر زخم ہنسکر کھائے ہے
دل وہ شیشہ ہے جو ہر پتھر سے ٹکرا جائے ہے

ہر ارادہ لڑکھڑائے ہر قدم تھرائے ہے
کیا یونہی اے رہنما منزل پہ پہونچا جائے ہے

اے نگاہِ یار کہہ لینے دے مجھ کو دل کی بات
انتہائے ضبطِ غم سے آدمی مر جائے ہے

دیکھئے پورے ہوں کب تک میرے ارمانوں کے خواب
آج تو ہر آرزو سے زندگی شرمائے ہے

دیدنی ہے اے وفا دشمن ہماری سادگی
کون اس دُنیا میں یوں دانستہ دھوکا کھائے ہے

فیصلہ اس کا نہیں ہوتا ہے راہِ شوق میں
دل کو سمجھاتا ہوں میں یا دل مجھے سمجھائے ہے

کاروبارِ زیست میں دل سے تعلق ہو نہ ہو
یہ مگر سچ ہے کہ تجھ بن جی بہت گھبرائے ہے

کہیں ایسا نہ ہو تم نے مجھے دل سے بھلایا ہو
بہت جی چاہتا ہے ان دنوں آنسو بہانے کو

یہ کس امید پر اُٹھ آئے تھے ہم اُن کی محفل سے
ابھی تک تو اجل آئی نہ وہ آئے منانے کو

جو تیرے لطف سے روشن ہوا تھا دل میں شرر
وہی، چراغ سرِ رہگزار ہو کے رہا

چھو کر اس زلف کو آتا ہے جو کوئی جھونکا
مجھ گرفتار کی زنجیر ہلا دیتا ہے

کون جانے دلِ وحشی پہ گزرتی کیا ہے
بارہا مجھ کو ترے در سے اُٹھا دیتا ہے

وہ بھی ہوتا ہے ہمیں سا کوئی مجبورِ حیات
رخِ ایام سے پردہ جو اُٹھا دیتا ہے،

جس کو دیوانہ بتاتے ہیں گلستاں والے
وہی دیوانہ بہاراں کا پتا دیتا ہے

کوئی ربط باہمی ہو کہ نہ ہو مگر یہ سچ ہے
کبھی دل جو یاد آیا مجھے تم بھی یاد آئے

یہی ماحصل ہے شاید مری داستانِ غم کا
کہیں ہنس دیا زمانہ کہیں آپ مسکرائے

اسی نسبت سے سحر نکھری ہوئی آئے گی
جس قدر رات یہ بیمار پہ بھاری ہوگی

ہمصفیرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

زمانہ منتظر چشم التفات رہے
ہم اُٹھ بھی آئے ترے در سے جھاڑ کر دامن

کہیں ملے مجھے لیکن پیامِ صبح ملے
فراز دار سے دیکھوں سحر کی پہلی کرن

رہِ طلب میں ہمیں کوئی ہمسفر نہ ملا
بس ایک دل جو کبھی دوست ہے کبھی دشمن

جفائے پیہم نے اہلِ دل کو وفا سے بیزار کر دیا ہے
اگر تمھیں کھیلنا تھا دل سے کبھی ہنساتے کبھی رُلاتے

رعایتی اعلان

مسائل و یزدان — مذہبی استفسارات و جوابات — جمالستان — نگارستان — شہوانیات — مکتوبات نیاز تین حصے — انتقادیات — مالہ و ماعلیہ

حسن کی عیاریاں — شہاب کی سرگزشت — فلاسفۂ قدیم — مذاکرات نیاز — فراست الید — نقاب اُٹھ جانے کے بعد — میزان

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں۔ — منیجر نگار۔ لکھنؤ

"اہلِ فردوس سے"

(فضا ابن فیضی)

تھی کبھی جو پائے گاہِ اہرمن
کیا وہی فردوس ہے تیرا وطن
ان کشاکشہائے رنگا رنگ سے
کیوں تہی دامن ہے تیری انجمن؟

لیکن اس فردوس میں رکھا ہی کیا
جز نبیذِ کوثر و نہرِ لبن
کتنے فردوسِ بریں کا عطر ہے،
دیکھ تو میرے جہاں کا بانکپن

چند حوروں کی جوانی کا نکھار
چند غلمانوں کے جسموں کی پھبن
اور وہ ماحولِ افسردہ ترا
جیسے گل ہو جائے شمعِ انجمن

طوبیٰ و تسنیم، خلدِ سلسبیل
زندگی کے چند عنوانِ حسن
کاروانِ لالہ و سرو و سمن
اس سے آگے صورتِ صحرائے ہو

زندگانی خستہ و افسردہ تن
میری دنیا میں خدا و اہرمن
زکرِ نوشا نوش صہبائے طہور
بے سرودِ نکتۂ شعر و سخن

میں شہیدِ غمزۂ دار و رسن
خشک سی یکسانیت ہر موڑ پر
بے طربِ حسنِ تنوع کا چمن
میری مستی، ضربتِ خیبر شکن

نے نفس میں بوئے اسرارِ حکم
نے نظر میں شوخیٔ تہذیب و فن
میری دنیا میں خلیلِ بت شکن
عشق کے سوزِ فسردہ کا مقام
ماتمِ ذوقِ نظر کی انجمن
خلوتِ فردوس تیری انجمن،

نے سیاست کا شعورِ بے پناہ
نے تمدن کا کٹیلا بانکپن
میرے مرہم میں بھی زخموں کی جلن
حاصلِ عمرِ رواں کا مرثیہ
شعلۂ سعیِ مسلسل کا کفن
تیری صبحوں پر اندھیر خندہ زن

ایک نم خوردہ شرر آبادِ شوق
آنکھ میں آنسو نہ آنسو میں جلن
ہر نگہ میری تماشا پیرہن
مرگِ دل، مرگِ نظر، مرگِ جنوں
مرگِ عشق و مرگِ فکر و مرگِ فن
حد تری پرواز کی صحنِ چمن

حاصلِ افسردگیہائے حیات
ہائے یہ تیری بہارِ بے چمن
میری مستی ہے حریفِ جان و تن
کیا نہیں اس راز سے آگاہ تو
اے شہیدِ کوثر و نہرِ لبن
تیری دنیا کوثر و نہرِ لبن
دیر سے فطرت کے آئینے میں ہے
میرا حسنِ زندگی پرتو فگن
مجھ کو تن کوشی ہے خارِ پیرہن
ہاں مرے سوزِ نفس کے فیض سے
جل رہی ہے تیری شمعِ انجمن
میری پاکیزہ امیدوں کا چمن
دور تیری جنتِ بوسیدہ سے
ایک میں نے بھی بنایا ہے چمن
تیرے عیشِ تازہ پیکر کی کرن
دیکھ! اے فردوس کے مارے ہوئے
ہے عروسِ رنگ و بو میرا وطن
میں یقیں ہوں اور تو تخمینِ وطن
ذرہ ذرہ ہے مری اس خاک کا
کارگاہِ نسترین و نسترن
وہ کفن ہے یا عروسی پیرہن
یہ چراغِ خندۂ گل کی بہار
پرتوِ کشمیر ہے خاکِ وطن
تابہ کے بے شمع تیری انجمن
یہ جمالِ نرگسِ رنگیں نظر
یہ فروغِ لالۂ رنگیں بدن
اپنی مستی کو بنا مینا شکن
رات کی ڈالی میں تاروں کے پھول
صبح کے آنچل میں سورج کی کرن
موجِ دریا ہوں، سراپستاں نہ ہوں
یہ فسوں تاثیرِ علم و ہنر
یہ کرشمہ کوشیٔ تہذیب و فن
یہ تمدن کی ہوائے شعلہ کار
یہ سیاست کی بساطِ عقل و فن
آ! سوئے شہرِ نگار آب و گل
آنکھ میں جمعیتِ خاطر کا حسن
اضطرابِ شوق دل میں موجزن
چھوڑ دے میری طرح تو بھی وطن

کبریائی

(ساقی جاوید۔ بی۔ اے)

ترا فن مسلم مگر اس کی عظمت اجالوں سے بڑھکر اندھیروں پہ قائم
ترے شکدے کا ہر اک نقش جھلکا ترے گلستاں کا ہر اک پھول مہکا
ہر اک ابنِ آدم قتیلِ عبادت، ہر اک بنتِ حوّا شہیدِ زمانہ
ترے آستاں پر جبینیں جھکا کر تری بارگہ سے ہمیں غم ملا ہے
بہاریں ہیں تیری مگر یہ بہاریں گل و یاسمن کیلئے بھی نہیں ہیں
یہی ہے ترا فن تو پھر اے مصور تجھے ناز اتنا ہے کیوں اپنے فن پر
تجھے معبدوں میں پہونچ کر پکارا مگر کوئی آواز اب تک نہ آئی
ہم انسان تسلیم کر ہی چکے ہیں یہ تیرا فلک ہے یہ تیری زمیں ہے
مگر تو ہے قادر تو پھر اے خدا یہ منارے بھی تجھ سے نہیں ٹوٹ سکتے
ازل کے ضوابط سے کیا تو کچھ اپنے قوانینِ ہستی نہیں چھانٹ سکتا
کسی نوعروسِ حسیں کے لئے کیا ترے پاس اک پیرہن بھی نہیں ہے
یہ مانا اطاعت تری فرض لیکن بتا اس اطاعت گزاری سے حاصل؟
ستارہ کے مالک بہاروں کے آقا خزانے میں کیا تیرے کچھ بھی نہیں ہے
غضب ہے کہ اک جرعۂ بادۂ ارغوانی نہیں بخش سکتا کسی کو
نظامِ جہاں تیرے بس میں نہیں ہے تو مجبوریوں کا ہی اعلان کر دے
چراغِ یقیں کے عطا کرنے والے تری یہ مشیت کی دیوار کیا ہے؟
اک اندھے کی لاٹھی ہے تیری خدائی ازل سے یونہی ہانکتا جا رہا ہے
معابد معابد مساجد مساجد ترا ڈھونڈتے پھر رہے ہیں سہارا

مکمل تری صنعتِ ارض و جنت مگر عصمتوں کے لٹیروں پہ قایم
مگر یہ ترا رنگ خانہ ہمیشہ زمیں پر اک آتشکدہ بن کے دہکا
ازل کے کہن سال ماہر شکاری ترے تیر کا آدمی ہے نشانہ
ترے بندگانِ وفا آشنا کی عرق ریزیوں کا یہ شاید صلہ ہے
ستارے ہیں تیرے مگر یہ ستارے کسی شبکدے کے دئے بھی نہیں ہیں
کبھی دیکھ اپنے کسی گلستاں کو نظر ڈال اپنی کسی انجمن پر
اِدھر گڑگڑاتے رہے تیرے بندے اُدھر مسکراتی رہی کبریائی
کم از کم یہی راز ہم کو بتا دے یہ دنیا ترے بس میں ہے یا نہیں ہے
چمکتے ہیں زریں کلاہوں پہ تارے یہ تارے بھی تجھ سے نہیں ٹوٹ سکتے
یہ شاہی خزانے غریبوں میں کیا تو برابر برابر نہیں بانٹ سکتا
ترے پاس اے صانعِ ماہ و انجم، مہ و نجم کی اک کرن بھی نہیں ہے
چمکتے ہیں جا کر کہیں اور تارے ہمیں ایسی اختر شماری سے حاصل؟
ہم اہلِ محبت کو کیا تو نے بخشا، خزانے میں کیا تیرے کچھ بھی نہیں ہے
تری کیا خدائی کہ اک لمحۂ شادمانی نہیں بخش سکتا کسی کو
کم از کم یہی ایک مشکل ہماری خداوندِ مطلق تو آسان کر دے
نزولِ کرم کو اگر مان بھی لیں تو پھر یہ بتا اس کا معیار کیا ہے؟
جو دامن ترے ہاتھ میں آگیا ہے اسی میں گہر ٹانکتا جا رہا ہے؟
تری خوئے سطوت نوازی کے قرباں تری خوئے سطوت نوازی نے مارا

بچا عظمتِ کبریائی بچا اب ترا رازِ سربستہ کھلنے لگا ہے
ازل کے مصور ترا مسئلہ بھی خرد کی ترازو میں تلنے لگا ہے

(مانی جائسی)

یاس میں آج تمناؤں کو رو بیٹھا میں
اعتبارِ الم عشق ہی کھو بیٹھا میں

مل گئی کش مکشِ ساحلِ دریا سے نجات
بیچ منجدھار میں کشتی کو ڈبو بیٹھا میں

تم کو جس راہ پہ چلنا ہے وہ اب صاف بھی ہے
راستہ چھوڑ کے اک سمت کو ہو بیٹھا میں

روز دُنیائے محبت میں یہی ہوتا ہے،
بات ہی کیا ہے تمنا کو جو رو بیٹھا میں

راہ پُرخار ہے، میں آبلہ پا ہوں مانی
غمِ منزل سے تو اب ہاتھ ہی دھو بیٹھا میں

(حیات لکھنوی)

کہا یہ قسمتِ ناکام نے کہ آئے ہم،
کبھی جو حرفِ تمنا زباں پہ لائے ہم

جہانِ غم سے یہ ذوقِ بلا ہے داد طلب
جگر پہ زخم لگے اور مسکرائے ہم

وہ آج مشقِ ستم پر ہوئے ہیں آمادہ
زہے نصیب کہ پھر ان کو یاد آئے ہم

تمام عمر کا رونا کبھی یاد آ ہی گیا
کبھی جو بھول کے دم بھر کو مسکرائے ہم

بیاں ہو کیسے بھرے مجمعِ قیامت میں
وہ رازِ دل، جسے خلوت میں کہہ نہ پائے ہم

(سیف حسن پوری)

بِڈھال ہیں غمِ ہستی سے تیرے دیوانے
نگاہِ ناز! نہ دے شوق کا پیام ابھی

ستم شعار! ستم سے ترے نجات کہاں
فریبِ رسمِ وفا ہے جہاں میں عام ابھی

بہت طویل سہی، رہگزارِ عشق اے دوست!
مٹا نہیں ہے جہاں سے جنوں کا نام ابھی!

(عبداللہ خاور بی، اے)

یہ کائنات ہے جذب و کشش کے دم سے مگر
نصیبِ جذب و کشش - بیخودی و رسوائی

خیال و قلب و نظر، ہو گئے — غبار آلود
یہ سوچتا ہوں نسیمِ بہار — کیا لائی —!

گزر رہے ہیں مہ و سال تیز گامی سے
نہ جانے کون سی منزل قریب تر آئی!!

ہر اک فسانہ کا ہے ماحصل یہی خاور
کہ آرزو کو ملا — داغِ ناشکیبائی!

(شفقت کاظمی)

اور ہوں گے جنھیں ہوگی امید
آپ سے دادِ وفا پانے کی

جرأت آموزِ ہوس ہیں کیا کیا
یہ ادائیں ترے شرمانے کی

تم نے اچھا کیا اگر نہ سُنا
دردِ دل قابلِ بیاں بھی نہیں

اُن سے ملنے کی آرزو ہے مجھے
جن کے ملنے کا اب گماں بھی نہیں

حدیثِ میکدہ

(عزیز عظیم آبادی)

حاصل نہیں لطف - اب کسی بات میں بھی
افلاس کے پہرے ہیں - خرابات میں بھی

اللہ رے ظلم - چشمِ رحمت کا عزیز
بے بادہ گزر رہی ہے - برسات میں بھی

سوکھے ہوئے ہونٹ ہیں - زبان چھلتی ہے
پینے کو - شراب تک - نہیں ملتی ہے

افکار کے پھول - کیا شگفتہ ہوں عزیز
بے بادِ سحر - کہیں کلی کھلتی ہے

اے کشتیٔ مے کے ناخدا - پیتا ہوں
اپنی طاقت سے کچھ سوا، پیتا ہوں،

پیمانۂ وظرف کی مجھے تاب نہیں
پیتا ہوں - شراب - یا دوا پیتا ہوں،

رحمت کی گھٹا - بہار بن کر چھائی
پیغامِ سرور و کامرانی لائی،

یہ سبزہ و گل - یہ برق و باراں کا ہجوم،
اے حسرتِ میکشی - قیامت آئی،

ساقی کو - قدح کشوں کو - میخانوں کو،
شیشوں کو - صراحیوں کو - پیمانوں کو

اے دورِ تمام - یاد کر لیتا ہوں،
دل جن کو بھلا چکا - اُن افسانوں کو

پیری سے بدل گئی - جوانی ساقی
فانی - سب کار و بار - فانی ساقی

ہاں بادہ بقدرِ شوق - رندوں کو پلا
مہلت دے گی نہ زندگانی ساقی

اُف موسمِ گل کا یہ زمانہ ساقی
رنگ و نکہت کا اک خزانہ ساقی

وہ گوشۂ مشرق سے اُٹھا ابرِ سیاہ
ساغر کو - مری طرف بڑھانا ساقی

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا - گھٹائیں کالی،
خنداں - ہر شاخ میں - چمن کی پالی

اے ابرِ کرم - یہی ہے فیضِ رحمت
میکش پیاسے رہیں - صراحی خالی

(رازِ یزدانی)

زندگی کی تلخیوں سے کارزار آساں نہیں
کارزار آساں بھی ہو لیکن فرار آساں نہیں

آہ یہ مجبور بن جانے کی ذمہ داریاں
اب کھلا دل پر کہ ترکِ اختیار آساں نہیں

تو بھی ان کا نام لیتا ہے تو جل جاتا ہو دل
دل - جسے پہچانتا اے رازدار آساں نہیں

اب تصور میں بھی احساسِ تصور ہو چلا
یوں بھی اب تسکین جانِ بیقرار آساں نہیں

رازؔ اس دنیا میں آوازِ شکستِ دل کے بعد
ہر صدا پر جھومنا مستانہ وار آساں نہیں

اس دل کو تمہارا - تمہیں اپنا کہیں ہم
کہنے کی کوئی بات ہی گویا نہ کہیں ہم

ٹھہرے تلووں سے کانٹے نکالنے والے
یہ ہوش ہے تو جنوں کامیاب کیا ہوگا

دامنِ صبر بھی ہاتھوں سے اگر چھوٹ گیا
او مرے ہاتھ سے دامن کو چھڑانے والے

نگاہِ ناز کو تکلیفِ التفات نہ دو،
تباہیوں کا ملال اس قدر نہیں ہے مجھے

یہ کیا ہوگیا اے غمِ نامرادی
کہ میں رو دیا - زندگی مسکرا دی

نثار جلوہ دل و دیں - ذرا نقاب اُٹھا
وہ ایک لمحہ سہی ایک لمحہ کیا کم ہے

شاید نگاہ حدِ ادب سے گزر گئی،
دیکھ اے جنونِ شوق کوئی مسکرا دیا

بقدرِ ظرف کہاں عشق کامیاب ہوا
بہت ہوا تو کوئی خانماں خراب ہوا

مین میاری :-

بچا کے خار سے دامن کو جب چلا ہوں میں
تلاش غنچہ و گل میں بھٹک گیا ہوں میں

نہیں نہیں مجھے واللہ شکوۂ دوری
کہ تم ہی تم ہو جہاں تک بھی دیکھتا ہوں میں

صحنِ چمن ہے خونِ تمنا سے لالہ زار
دیوانے چھوڑ کر یہ بہاریں کہاں چلے

متین ان کا تغافل بھی ہے خلوص آمیز
خوشا نصیب کہ وہ یاد آئے جاتے ہیں

یہ راز پوچھئے گلہائے نو شگفتہ سے
ہنسی جب آتی ہے کیوں بے اختیار آتی ہے

یہ اور بات ہے کانٹوں کو تازگی نہ ملے
چمن میں ایک سی سب پر بہار آتی ہے

پیدا نہ ہو نگاہ میں جب تک شعور دید
جلوے تمہارے دیکھ لے ایسی نظر کہاں

طوفاں سے بچ کے ڈوبی ہے کشتی کہاں نہ پوچھ
ساحل بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا

یہ ہستی اور الجھتی جاری ہے
میں اس کو جس قدر سلجھا رہا ہوں،

آ گئی پھر بہار، دیوانے
راہ تکتے ہیں تیری، ویرانے

ہنس پڑے دیکھ کر وہ آئینہ
آ گیا کیا نظر خدا جانے

بیخود ہوئے کچھ ایسے نام بہار سن کر
آگے نہ بڑھ سکے ہم عنوانِ داستاں سے

حسرت بھری نظر سے دامن کو دیکھتا ہوں
راتوں کو ٹوٹتے ہیں تارے جب آسماں سے

(بیتاب بریلوی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

خود جرأتِ نگاہ نے پردے اُٹھا دئے
ہم نے ہجومِ شوق میں آواز دی کہاں

غنچے کھلے نہ شیشہ و ساغر تھے رقص میں
آواز کچھ اُٹھی بھی تو آخر اُٹھی کہاں،

چھانے لگی تھی نیند حوادث کے ساز پر
کمبخت دل نے ٹوٹ کے آواز دی کہاں

اتنا تو تھا کہ شکوۂ تشنہ لبی نہ تھا
پیتے رہے نگاہ سے ساغر میں تھی کہاں

وہ آستاں وہ بزم نہ وہ رہگذار دوست
بیٹھے ہیں آج کھوئے ہوئے آپ بھی کہاں

محترمہ کنول نسیم کنجاہی :-

صاحبِ عرش نے خود خاک نشینوں کو دئے
کتنے ہی سینوں پہ انوار اُتارے اُسنے
کتنے ہی امن کے شہزادے جہاں میں آئے
فطرتِ انساں کی ہے پیکار و تصادم یکسر
مذہب و دین بھی پردہ ہیں ملوکیت کا
کارواں گزرے بہر رنگ اسی منزل سے
فکر و احساس کی قندیل بجھا دو للّٰلہ
ذہن محبوس ہیں فکر آج بھی زندانی ہے
نہ کوئی شمع نہ جگنو نہ ستارہ نہ چراغ
ابنِ آدم کو ہے تخریب پسندی کا جنوں
غم کی ظلمت میں یہ ڈوبا ہوا گہرا سا سکوت
اپنی خوں گشتہ تمنائیں بھی ہنسنا سیکھیں
دل میں امید کی اک شوخ کرن پھر اُبھری
آسماں تاب نظاروں کو پلٹ کر دیکھو

کتنے رخشندہ تخایف کی زباں سے پیغام
کتنی سانسوں میں ڈھلا نغمۂ سازِ الہام
جنگ کے چہرے پہ لیکن ہے وہی برنائی
ہے بپا غلغلۂ قیصری و چنگیزی
نام پر حضرتِ یزداں کے رواخونریزی
ہر قدم شورشِ پرویزی و سلطانی ہے
اس کی فطرت بھی تو نمرودی و ہامانی ہے
کس نے دی خاک کے پُتلے کو غلامی سے نجات
زندگی ہے کہ برستے ہوئے ساون کی رات
خون آلود ہے تاریخ کا ایک ایک ورق
سوچتی ہوں کبھی ہنگامۂ گفتار بنے
(دل کا) یہ خانۂ تاریک ضیا کار بنے
اُفقِ ذہن پہ یہ سُرخ نشاں کیسا ہے
شفقِ نو کا یہ سیلابِ جواں کیسا ہے

یہ بھی رنگین و منقش سا نہ دھوکا ہو کہیں

اکرم دھولیوی :-

نیرنگیٔ چمن کا پوچھو نہ کچھ فسانہ
اکثر بہار ہی میں اُجڑا ہے آشیانہ
جس وقت یاد آئی بے اختیار آئی
اب تک ہے تم سے مجھ کو اک ربط والہانہ
روداد آرزو کی نیرنگیاں نہ پوچھو
میرے لئے حقیقت اُن کے لئے فسانہ
آتے رہے وہ جب تک تجدید آرزو کو
آیا کیا پلٹ کر گزرا ہوا زمانہ،
اک بات بیخودی میں منہ سے نکل گئی تھی
دنیا بنا رہی ہے اب تک اُسے فسانہ

بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کمیشن نہیں ملے گا)

تاریخ اُردو مطبوعہ :

گنج شائیگاں معروف پچکسال محمد رفیع تاریخ سکہ جات مصور ۔۔۔ ۲ے
تاریخ دربار تاجپوشی ۔۔۔ حافظ نذیر احمد ۔۔۔۔۔ ۳ے
قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ مصور ۔۔ اسرار حسین ۔۔۔ ۱۴ے
تاریخ ڈھاکہ مصور ۔۔۔ رحمان علی طیش ۔۔۔۔۔ ۱۲ے
تاج التواریخ مصور سہ جلد کامل ۔۔ نصرت علی ۔۔۔۔ ۵ے

سوانح عمری اُردو مطبوعہ :

الغزالی ۔۔۔۔۔ شبلی نعمانی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳ے
تذکرہ کاملان رامپور ۔۔۔ احمد علی خاں ۔۔۔۔۔ ۱۰ے
تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔۔۔ سید احمد قادری ۔۔۔ ۲ے
حیات خسرو ۔۔۔۔ ۔۔۔ شبلی نعمانی ۔۔۔۔۔ ۱ے
بہادر شاہ ظفر ۔۔۔۔ امیر احمد ۔۔۔۔۔۔ ۵ے
حیات امیر خسرو ۔۔۔۔ سعید احمد ۔۔۔۔۔۔ ۲ے
سیرۃ النعمان ۔ سوانح امام ابوحنیفہ ۔۔ شبلی نعمانی ۔۔۔ ۲ے
اولیائے کرام کی سوانح عمری ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۵ے

تذکرۂ شعراء اُردو مطبوعہ :

تذکرہ آب بقا ۔۔۔ عبدالرؤف عشرت ۔۔۔۔۔ ۱ے
ہندو شعراء ۔۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔۔۔۔ ۳ے
تذکرۃ الخواتین ۔۔۔ عبدالباری آسی ۔۔۔۔۔ ۲ے
تذکرۂ آب حیات ۔۔۔ محمد حسین آزاد ۔۔۔۔۔ ۱۰ے
خطبات گارساں دتاسی ۔ اکچر ہندوستانی زبان پر شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ۱۰ے

ادب اُردو مطبوعہ :

صنمخانۂ عشق ۔۔۔۔ امیر احمد امیر ۔۔۔ ۱۰ے
دیوان ذوق ۔۔۔ شیخ ابراہیم ۔۔۔۔۔۔۔ ۴ے
کلیات ناسخ ۔۔۔ امام بخش ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰ے
دیوان میر حسن ۔۔۔ میر حسن ۔۔۔۔۔۔ ۴ے
دیوان رنگین و انشا ۔ ریختی کلام ۔۔۔۔۔۔ ۵ے
دیوان تاج سخن ۔۔۔ جلیل حسن خاں جلیل ۔۔۔ ۱۰ے
نظم دل افروز کلیات تسلیم ۔ منشی امیر اللہ ۔۔۔۔۔ ۵ے
آیات وجدانی ۔ مجموعہ غزلیات مع شرح ۔ مرزا واجد حسین یگانہ ۔ گلدستہ تجلی ۱۰ے
کلیات حسرت ۔ فضل الحسن موہانی ۔۔۔۔۔۔ ۱۰ے
دیوان ثاقب ۔۔۔ ذاکر حسین ثاقب ۔۔۔۔۔۔ ۱۰ے
دیوان صفی ۔۔۔ سید علی نقی صفی ۔۔۔۔۔۔ ۱ے
مکمل شرح کلام غالب ۔۔ مرتبہ عبدالباری آسی ۔۔۔۔ ۲ے
کلیات نظیر ۔۔۔ نظیر اکبر آبادی ۔۔۔۔۔۔ ۲ے
مجموعہ قصاید مومن ۔۔۔ مرتبہ ضیا احمد ۔۔۔۔۔۔ ۵ے
کلیات نظیر اکبر آبادی ۔۔ مرتبہ عبدالباری آسی ۔۔۔۔ ۱۰ے
مثنوی میر حسن ۔۔۔ میر حسن ۔۔۔۔۔۔۔ ۲ے
مثنوی گلزار نسیم ۔۔۔ پنڈت دیا شنکر ۔۔۔۔۔۔ ۱ے

مرثیے اُردو مطبوعہ :

مراثی میر انیس ۔ جلد اول و دوم و سیوم و چہارم ۔ میر انیس ۔۔ ۱۴ے
مراثی میر انیس ۔ جلد ششم ۔ مرتبہ میر عبدالحسین ۔۔۔۔ ۱۰ے
مراثی میر مونس ۔ جلد ششم مرتبہ میر عبدالحسین ۔۔۔۔ ۱۰ے

متفرق اُردو مطبوعہ :

فسانۂ عجائب ۔۔ مرزا رجب علی بیگ سرور قصہ ۔۔۔۔۔ ۱۴ے
رسالہ فن شاعری ۔۔ مرزا سلطان احمد ۔۔۔۔۔۔ ۲ے
تنقیح اللغات ۔۔۔ ضامن علی جلال لغت قلمی ۔۔۔ ۱۰ے
موازنہ انیس و دبیر ۔۔ شبلی نعمانی ۔۔۔۔۔۔ ۵ے
محاسن کلام غالب ۔۔ ڈاکٹر عبدالرحمن ۔۔۔۔۔۔ ۲ے
تذکرۂ آب بقا ۔۔ عبدالرؤف عشرت ۔۔۔۔۔۔ ۱ے

تاریخ فارسی مطبوعہ :

جہانگیر نامہ ۔۔۔ خواجہ ابوالحسن ۔۔۔۔۔۔۔ ۵ے
تاریخ فرشتہ ۲ حصہ محمد قاسم فرشتہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۳۵ے
درۂ نادرہ ۔۔۔ مرزا مہدی خاں ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰ے

(بقیہ کتابیں صفحہ اول پر ملاحظہ کیجئے)

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے مُلک کے ادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، (قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول)

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر اندوہ خیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی، تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط، قیمت بارہ آنہ (علاوہ محصول)

مالہ و ماعلیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور اس کا ثبوت انھوں نے دور حاضر کے بعض اکابر شعراء مثلاً جوش، جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے، قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشا، عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے، عار (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دُنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے، قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اردو غزل گوئی پر عصر بہ عصر ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ادبیہ و حقیقت نگاری، قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

اسکے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی پر پیشینگوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۴۲ء

اسلامی نمبر، جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے، مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے عا/

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد شاعر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول،

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم و ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ عا/ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے درخشاں کو نہ بھول جائیے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے گئے ہیں اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں ارس ہنڈی کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے۔ جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے عا/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء / حسرت نمبر

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، قیمت دو روپے عا/ (علاوہ محصول)

جنوری، فروری ۱۹۵۳ء

اوغ نمبر جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، حیدرآباد کے زمانے کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپے عا/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرماں روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپے عا/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) زیر تتمہ۔ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ہے (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ